الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

جب آدمی کا ماضی اور حال لُٹ چکا ہو
اُس وقت بھی اُس کا مستقبل محفوظ رہتا ہے

نومبر ۱۹۸۳ □ قیمت فی پرچہ — تین رُوپے □ شمارہ ۸۴

اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

نومبر ۱۹۸۳
شمارہ ۸۴

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

نماز

قرآن میں ہدایت دی گئی ہے کہ نماز قائم کرو، بے شک نماز فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے (اقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر) ابن ابی حاتم نے حضرت عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

من لم تنھہ صلوٰتہ عن الفحشاء والمنکر فلا صلوٰۃ لہٗ — جس کی نماز اس کو فحشاء اور منکر سے نہ روکے تو اس کی نماز نماز نہیں۔

نماز کیا ہے، نماز اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ آدمی ایک ایسے خدا کے سامنے زندگی گزار رہا ہے جس کو آدمی اگرچہ نہیں دیکھتا، مگر خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ جو آدمی مسجد سے یہ سبق لے کر لوٹے، کیا وہ باہر آ کر خدا سے غافل زندگی گزار سکے گا۔ نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ خدا سب سے بڑا ہے۔ جو آدمی اس اقرار میں سچا ہو کیسے ممکن ہے کہ نماز کے بعد وہ اپنی بڑائی کا جھنڈا اٹھانے میں مصروف ہو جائے۔ نماز میں آدمی جو کچھ پڑھتا ہے وہ خدا کے سامنے اس بات کا عہد ہوتا ہے کہ وہ خدائی احکام کا پابند بن کر زندگی بسر کرے گا۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ باہر نکل کر وہ لوگوں کے درمیان سرکش اور باغی کی طرح رہنے لگے۔ نماز کے افعال اس بات کا اظہار ہیں کہ آدمی کا سینہ خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہے۔ پھر کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ آدمی مسجد میں تو خدا کے خوف و محبت سے سرشار ہونے کا دعویٰ کرے اور جب باہر نکلے تو اس طرح رہنے لگے جیسے کہ اس کے سینے میں نہ خدا کا خوف ہے اور نہ خدا کی محبت۔

نماز اگر حقیقی روح کے ساتھ پڑھی جائے تو یقیناً وہ فحشاء اور منکر سے روکنے والی بن جائے گی۔ لیکن اگر نماز حقیقی روح سے خالی ہو تو وہ محض ایک رسم ہو گی جس کا آدمی کی اصل زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ بظاہر نماز ہو گی مگر حقیقۃً وہ نماز نہ ہو گی۔ کیوں کہ وہ آدمی کو فحشاء اور منکر سے روکنے والی نہ بن سکی۔

یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ — باپ کو کھڑا دیکھ کر بھی جو بیٹا لیٹا رہے اس کے اندر باپ کا ادب نہیں۔ بہن کو فاقہ میں دیکھ کر جس بھائی کی مٹھی نہ کھلے وہ بھائی بھائی نہیں۔ دوست کی موت کی خبر جس کا قہقہہ بند نہ کرے اس کی دوستی دوستی نہیں۔

کلیسا کی مثال

گلیلیو (۱۶۴۲-۱۵۶۴) اٹلی کا بہت بڑا سائنس داں تھا۔ اس نے پہلی بار دوربین تیار کی اور علم الافلاک میں بہت سی اہم چیزیں دریافت کیں۔ ساڑھے تین سو سال پہلے اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "دو بڑے نظام ہائے عالم پر گفتگو"۔ اس کتاب میں گلیلیو نے زمین اور شمسی نظام کے مسئلہ پر بحث کی۔ اس نے کوپرنیکس کے اس نظریہ کی تائید کی کہ زمین چپٹی نہیں ہے بلکہ گول ہے اور یہ کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھوم رہا ہے بلکہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔

رومی کلیسا نے اس نظریہ کو مسیحی عقائد کے خلاف قرار دیا۔ کتاب مقدس (تورات اور انجیل) میں اگرچہ یہ مسئلہ درج نہ تھا۔ تاہم مسیحی بزرگوں نے بطور خود اپنے عقیدہ کی جو تفصیلات مرتب کیں ان میں انھوں نے اس نظریہ کو درج کر دیا۔ کلیسا یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ کتاب کے متن کی طرح اس کے حواشی بھی مقدس ہیں جو اس کے بزرگوں نے لکھ رکھے ہیں، اس لئے اس نے ان حواشی کو عین دین سمجھا اور اس نے گلیلیو کو بے دین قرار دے دیا۔ اس زمانہ میں کلیسا کو مسیحی دنیا پر زبردست اقتدار حاصل تھا۔ حتیٰ کہ یورپ کے کئی ملکوں (اسپین، اٹلی وغیرہ) میں اس کی متوازی مذہبی عدالتیں قائم تھیں۔ ان عدالتوں کے ذریعہ کلیسا براہ راست خود اپنے اختیار سے ہر قسم کی سزائیں دے سکتا تھا۔

جب گلیلیو نے اپنی غلطی نہیں مانی تو اس کا مقدمہ رومی کلیسا کی مذہبی عدالت میں پیش ہوا۔ اور اس نے اس کو عمر قید کی سزا دے دی۔ اس کے بعد دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک کے لئے اٹلی میں علمی تحقیق کا کام رک گیا ——— خدائی متن کے ساتھ بزرگوں کی تشریحات کو مقدس سمجھنے کا یہ بھیانک انجام تھا جو اٹلی کو بھگتنا پڑا۔

کلیسا نے اپنے دائرہ اختیار میں کچھ اہل علم کا خاتمہ کر دیا۔ مگر خود علم کا خاتمہ کر دینا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ کلیسا کا دائرہ اختیار بہرحال محدود تھا۔ جب کہ علم کائناتی بنیادوں پر قائم ہے، علم وہ چیز ہے جس کی جڑیں سارے زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چنانچہ کلیسا کے مخالفانہ رویہ کے باوجود علم بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نوبت آگئی کہ علم کو عمومی بالادستی حاصل ہوگئی۔ کلیسا کا اختیار ماضی کا افسانہ بن کر رہ گیا۔

اب کلیسا کے لئے اس کے سوا کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ نئی صورت حال کو تسلیم کرے۔ جس گلیلیو کو وہ اپنے یہاں مرتد اور قابل سزا کے خانہ میں لکھے ہوئے تھا وہ باہر کی پوری علمی

دنیا میں ہیرو کا مقام حاصل کر چکا تھا۔ یہ واقعہ اب کلیسا کی تاریخ میں ایک شرمناک واقعہ بن گیا۔ وہ کلیسا کی غیر علمی روش کے لئے ایک علامتی مثال کی حیثیت رکھتا تھا۔ حتی کہ جو چیز پہلے گلیلیو کا مسئلہ تھی وہ اب خود کلیسا کا مسئلہ بن گئی۔ کیوں کہ گلیلیو کی علمی حیثیت کا اعتراف کئے بغیر کلیسا اپنے اعتماد کو بحال نہیں کرسکتا تھا۔

۱۹۸۰ میں کلیسا نے اس مسئلہ پر نظر ثانی کے لئے آٹھ افراد پر مشتمل ایک خصوصی کمیشن مقرر کیا۔ اس کے ارکان میں مورخ، ریاضی داں اور مسیحی علماء شامل تھے۔ کمیشن طویل غور وخوض اور بحث ومطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ علم نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور اس معاملہ میں یقینی طور پر گلیلیو حق پر تھا۔

اس کے بعد مئی ۱۹۸۳ میں ویٹیکن میں ایک خاص اجلاس ہوا جس میں مورخین، مسیحی علماء اور سائنس دانوں کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ پوپ جان پال ثانی خود بھی اس تاریخی اجتماع میں موجود تھے۔ پوپ نے تمام لوگوں کے سامنے اس معاملہ میں کلیسا کی غلطی کا اعتراف کیا اور گلیلیو کے برسرِ حق ہونے کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا:

> The Church's experience, during the Galileo affair and after it, has led to a more mature attitude and to a more accurate grasp of the authority proper to her.

گلیلیو کے زمانہ میں اور اس کے بعد کلیسا کے تجربہ نے اس کو زیادہ پختہ نقطۂ نظر اختیار کرنے اور زیادہ صحیح ادراک تک پہنچایا ہے جو اس کے لئے مناسب ہے (گارجین ۲۹ مئی ۱۹۸۳)

یہ تضاد کیوں

کلیسا نے کیوں سترہویں صدی عیسوی میں گلیلیو کا انکار کیا تھا اور بیسویں صدی میں کیوں اس نے گلیلیو کا اقرار کر لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں گلیلیو کی شخصیت ایک متنازعہ (Controversial) شخصیت تھی۔ جب کہ بیسویں صدی عیسوی میں وہ ایک تسلیم شدہ (Established) شخصیت بن چکی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ کلیسا کا ایک اور شخصیت کے ساتھ پیش آیا۔ یہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہے۔ مسیحی کلیسا نے ساتویں صدی عیسوی میں حضرت محمد کا انکار کیا۔ اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ ساتویں صدی میں حضرت محمد کی شخصیت ایک متنازعہ شخصیت تھی۔ اب دوبارہ یہ ہوا ہے کہ بیسویں صدی میں پہنچ کر حضرت محمد کی شخصیت ایک ثابت شدہ شخصیت بن چکی ہے۔ آج علم اور تاریخ کے

اتنے شواہد آپ کی نبوت کی تصدیق پر جمع ہو چکے ہیں کہ اب باعتبار حقیقت کسی کے لئے اس پر شبہ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی (تقابل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر موریس بوکیل کی مندرجہ ذیل کتاب ــــ بائبل، قرآن اور سائنس :

(The Bible, The Quran, and Science)

پھر کیا وجہ ہے کہ جن اسباب کی بنا پر کلیسا نے گلیلیو کو مان لیا، انھیں اسباب کی موجودگی میں وہ حضرت محمد کو نہیں مانتا۔ وہ بدستور آپ کو بناوٹی نبی (False Prophet) کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس کی وجہ وہ فرق ہے جو باعتبار نوعیت دونوں شخصیتوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ گلیلیو کو ماننا صرف ایک فنی غلطی کا اعتراف ہے۔ جب کہ حضرت محمد کو ماننا اپنے پورے وجود کی نفی کے ہم معنی ہے۔

گلیلیو ایک فلکیات داں تھا۔ اس کا کیس فلکیاتی علم کا کیس تھا۔ جب کہ حضرت محمد ایک پیغمبر تھے اور آپ کا کیس خدا کی پیغمبری کا کیس۔ یہ فرق دونوں کے معاملہ کو نوعی طور پر ایک کو دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ گلیلیو کو ماننا صرف ایک علمی سچائی (Scientific truth) کو ماننا ہے۔ اس کے برعکس حضرت محمد کو ماننا ایک مذہبی سچائی (Religious truth) کو ماننا۔ گلیلیو کو ماننا کلیسا کے لئے ایک ایسے خارجی واقعہ کو ماننا تھا جس سے اس کے اپنے اوپر کوئی زد نہیں پڑتی تھی۔ اس کا اپنا مخصوص ڈھانچہ اس کے بعد بھی بدستور برقرار رہتا تھا۔ اس کے برعکس حضرت محمد کو ماننا ایک ایسے واقعہ کو ماننا تھا جس کا براہ راست تعلق اس کے اپنے ڈھانچہ سے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد کو مانتے ہی پاپائیت اپنے وجود کا جواز کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد کلیسا کا پورا محل اچانک زمین پر گر پڑتا ہے۔

حضرت محمد نے توحید کی تعلیم دی جب کہ موجودہ کلیسا کا سارا ڈھانچہ تثلیث کے عقیدہ پر قائم ہے۔ حضرت محمد نے حضرت مسیح کو خدا کا پیغمبر بتایا جب کہ کلیسا حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دے کر اپنا مذہبی قلعہ تعمیر کئے ہوئے ہے۔ حضرت محمد نے ذاتی عمل کو نجات کی بنیاد قرار دیا، جب کہ کلیسا کا سارا مذہبی ڈھانچہ کفارہ کے عقیدہ پر قائم ہے، وغیرہ۔ ایسی حالت میں کلیسا کیسے حضرت محمد کو مان لے۔

گلیلیو کا اقرار کرنے کے بعد بھی کلیسا کی حیثیت بدستور باقی رہتی تھی۔ جب کہ حضرت محمد کا اقرار کلیسا کے لئے خود اپنے انکار کے ہم معنی ہے۔ اور بلاشبہ دنیا میں ایسے لوگ سب سے زیادہ کم پائے جاتے ہیں جو اس قسم کی جرأت کا ثبوت دے سکیں۔ کلیسا صرف اپنی نفی کی قیمت پر حضرت محمد کو مان سکتا ہے۔ اور اس دنیا میں کون ہے جو اپنی نفی کی قیمت پر کسی سچائی کو ماننے کے لئے تیار ہو جائے۔

مسلمانوں کا مسئلہ

۱۵ مئی ۱۹۸۳ کو میں مراد آباد میں تھا۔ وہاں میری دو تقریریں ہوئیں۔ ایک کا موضوع تھا، دینی تقاضے۔ اور دوسری کا موضوع تھا، تعمیر ملت۔ تعمیر ملت کے موضوع پر جب تقریر ختم ہوئی تو ایک صاحب اٹھے جو نہایت سنجیدہ اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے دو سوالات کئے۔

پہلا یہ کہ آپ نے تعمیر ملت کے موضوع پر جو کچھ کہا ہے وہ سب اسباب کی باتیں ہیں مگر مراد آباد کا تجربہ اس سے مختلف ہے۔ مراد آباد کے فساد (۱۹۸۰) کے آخری مرحلہ میں مسلمان اس طرح گھر گئے کہ ان کے سامنے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ انھوں نے سوچا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ دعا کی جائے۔ چنانچہ مسلمانوں نے مل کر دعا کی اور اس کے بعد اچانک صورت حال بدل گئی اور شہر میں امن قائم ہو گیا۔ دوسرا سوال یہ کہ اگر سارا معاملہ اسباب کا ہے تو اس میں مسلمان اور غیر مسلمان سب برابر ہیں، پھر مسلمان کا وہ امتیاز کیا ہے جو خیر امت کی حیثیت سے انھیں دیا گیا ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میں نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون عام (الرعد ۱۱) سے ہے اور آپ نے جو بات کہی اس کا تعلق قانون اضطرار (النمل ۶۲) سے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ جب ایسے حالات میں گھر جائے جہاں بظاہر اس کے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو اور وہ دل سے خدا کو پکارے تو خدا اس کی مدد کرتا ہے (یونس ۲۳-۲۲) مگر جیسا کہ قرآن میں صراحت ہے، حالت اضطرار میں مدد کا تعلق ہر ایک سے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ کسی اضطراری واقعہ سے عمومی قانون اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے جو بات کہی وہ فساد سے پہلے کی ہے۔ اور آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ فساد کے بعد کی ہے۔ فساد کے بعد جب ہنگامی حالت پیدا ہو چکی ہو، اس وقت کیا کرنا ہے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ مگر فساد ہونے سے پہلے حالات کو معتدل رکھنے کے لئے کیا کیا جائے، یہ بالکل مختلف مسئلہ ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں برداشت کو کھو دیا ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی عدم برداشت کا مزاج تمام فسادات کا اصل سبب ہے۔ جب تک کہ اس مزاج کو دور نہ کیا جائے، کسی بھی دوسری تدبیر سے فسادات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان پچھلے ۲۵ سال

سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اقلیتی کردار دینے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ یہ لڑائی حکومت اور حکمراں پارٹی سے تھی۔ بالآخر ۱۹۸۲ میں ان کو نئے ایکٹ کے تحت اقلیتی کردار دے دیا گیا۔ مگر مسلمانوں کی لڑائی بدستور جاری ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے اس لڑائی کا نشانہ نئی دہلی تھا، اب اس لڑائی کا نشانہ خود ان کا مسلمان وائس چانسلر ہے

اس سے پہلے ہندستان کے بیشتر مسلمانوں نے تقسیم ملک کی مانگ کی۔ اس مانگ کے لئے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ مشترک ہندستان میں ملک کا اکثریتی فرقہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ اس مطالبہ کے مطابق ان کو پاکستان دے دیا گیا۔ مگر ان کے شکایتی ذہن نے اپنی شکایت کے لئے نیا نشانہ تلاش کر لیا۔ اب مشرقی پاکستان کو یہ شکایت ہوگئی کہ مغربی پاکستان اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے۔ دوبارہ خود اپنے درمیان ایک بھیانک لڑائی ہوئی جو اس پر ختم ہوئی کہ مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان سے علیحدگی اختیار کرلی۔ تاہم ۱۹۸۳ کے واقعات بتاتے ہیں کہ اصل مسئلہ بدستور باقی ہے۔ اب سندھ کے مسلمانوں کو پنجاب کے مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ یہ لڑائی جاری ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ وہ کہاں جاکر ختم ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہر بات میں ان کا بے برداشت ہو جانا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس مزاج کو ختم نہ کریں، ان کے لئے زمین تنگ رہے گی، خواہ وہ ایک ملک کا معاملہ ہو یا دوسرے ملک کا۔

دوسرے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ مسلمان اپنے تقرر کے اعتبار سے بلاشبہ خیرامت ہیں اور اس حیثیت سے ان کے ساتھ خدا کا ایک امتیازی معاملہ ہے۔ خدا نے مسلمانوں کے لئے اپنی ایک خصوصی مدد مقدر کی ہے جو اس نے دوسروں کے لئے مقدر نہیں کی۔ مگر اس خصوصی مدد کا استحقاق خیرامت کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری انجام دینے پر ہے نہ کہ صرف نسلی مسلم نسل سے متعلق ہونے کی بنا پر۔

یہ ذمہ داری دعوت وتبلیغ کی ذمہ داری ہے۔ دعوت وتبلیغ سے مراد مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام نہیں ہے۔ بلکہ غیر مسلموں تک خدا کا سچا دین پہنچانا ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح بھی ایک کرنے کا کام ہے اور اس کو ضرور کیا جانا چاہئے۔ مگر غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدد کا وعدہ کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان اصلاحی کام کرنے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ وعدہ صرف اس وقت پورا ہوگا جب کہ غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کا کام کیا جائے اور اس کو اس کے تمام آداب وشرائط کے ساتھ انجام دیتے ہوئے اتمام حجت کی حد تک پہنچایا جائے۔

بے آمیز حق

ایک ہے عوام کی رعایت کرنا۔ اور دوسرا ہے خدا کی رعایت کرنا۔ جو تحریک عوامی جذبات کی رعایت کرے وہ بہت جلد اپنے ماحول میں عزت اور مقبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ اس کا سفر آسانیوں کے جلو میں طے ہوتا ہے۔ دوسری تحریک وہ ہے جو خدا کی مرضی کا لحاظ کر کے اٹھے۔ اس کو اپنے ماحول میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی قسم کی تحریک میں عوام اپنے جذبات سے ہم آہنگی پا کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جب کہ دوسری قسم کی تحریکیں ان کے مانوس ذہنی ڈھانچہ کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے مسلمات پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے وہ اس کو قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتے۔ ان کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی دعوت کو ہمارے مزاج کے موافق بناؤ۔ اور داعی جب ان کے مطالبہ کو پورا نہیں کرتا تو وہ اس کے سخت ترین دشمن بن کر ان کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہی دوسری صورت تھی جو مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئی۔ آپ خالص توحید کے داعی تھے۔ مگر خالص توحید قریش کے لئے قابل قبول نہ ہو سکی۔ کیوں کہ اس سے ان کے بزرگوں پر زد پڑتی تھی۔ اس میں ان کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ بدلنا پڑتا تھا۔ اس میں ان کو ایک ایسی چیز کی طرف اقدام کرنا تھا جس میں انھیں اپنی تمام مصلحتوں کو نظر انداز کر دینا پڑے۔ چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ مصالحت کا انداز اختیار کریں۔ اپنی بات کو اس انداز سے پیش کر یں کہ ہماری بات سے اس کا ٹکراؤ نہ ہو (ہود ۱۱۲، بنی اسرائیل ۷۳، یونس ۱۵)

ان حالات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بے آمیز حق کا داعی بننا مشکل ترین کام تھا۔ بشری تقاضے کے تحت یہ خیال آپ کے دل میں آسکتا تھا کہ مخاطب کے ساتھ کچھ مصلحت اور رعایت کا انداز اختیار کیا جائے۔ مگر خدا کا حکم تھا کہ ذرا بھی ان کی رعایت نہ کی جائے۔ صرف حق کی رعایت کی جائے اور خدا کے دین کو پوری طرح بے آمیز صورت میں پیش کیا جائے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں یہ حدیث آئی ہے۔

قال ابو بکر سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما شیبک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شیبتنی ھود واخواتھا

حضرت ابو بکر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کس چیز نے آپ کو بوڑھا کر دیا۔ آپ نے فرمایا: مجھ کو ہود اور اس کے مثل سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔

اپنے لئے کچھ دوسروں کے لئے کچھ

سر رچرڈ ڈابسن (Sir Richard Dobson) انگلستان کے ایک کامیاب صنعت کار ہیں وہ ۲۱ سال تک برٹش، امیریکن، ٹوبیکو (British American Tobacco) کے اعلیٰ ذمہ دار رہے ہیں۔ وہ ایک سال تک برٹش لیلینڈ (British Leyland) کے چیئرمین رہے ہیں۔ یہ فرم دو منزلہ بس بنانے کے لئے بہت مشہور رہے۔

سر رچرڈ ڈابسن آج کل لندن کے ایک خاص علاقہ، رچمنڈ (Richmond) میں مارچ منٹ روڈ (Marchmont Road) پر رہتے ہیں۔ یہ لندن کی ایک نہایت پرسکون سڑک ہے اور صرف کروڑ پتی قسم کے لوگ یہاں رہتے ہیں۔

حال میں ایسا ہوا کہ رچمنڈ علاقہ کی ایک سڑک خراب ہوگئی۔ اور اس پر از سر نو تعمیر کا کام چھیڑنا پڑا۔ اس سڑک پر لندن کی بس نمبر ۶۵ چلتی تھی۔ چونکہ یہ سڑک تعمیری کام کی وجہ سے ناقابل استعمال ہو رہی تھی اس لئے عارضی طور پر اس کی روٹ بدل دی گئی اور کچھ دنوں کے لئے اس کو مارچ منٹ روڈ سے لے جایا جانے لگا۔

سر رچرڈ ڈابسن اگرچہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتے ہیں تاہم اپنے مکان کے سامنے کی سڑک سے دھواں نکالنے والی بس کا گذرنا انھیں پسند نہیں آیا۔ گارجین (۱۴ اگست ۱۹۸۳) نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے لندن کے اخبار میں اپنا ایک احتجاجی خط چھپوایا جس میں انھوں نے تحریر کیا تھا کہ تنہا بس کے ڈیزل ایندھن کی بو ہی توہین آمیز اور صحت کے لئے خطرناک ہے:

The smell of the diesel fuel alone is an affront and a health hazard.

سر رچرڈ ڈابسن سگریٹ اور بس کے تاجر ہیں۔ یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو دھواں نکال کر فضا خراب کرتی ہیں۔ وہ ساری زندگی دھوئیں کا کاروبار کرتے رہے۔ یہ دھواں جب تک دوسروں کے گھر میں پہنچ رہا تھا انھیں اس کی خرابی کا احساس نہیں ہوا۔ مگر ایک بار جب اتفاق سے وہ ان کے اپنے گھر کے اندر پہنچ گیا تو وہ چیخ اٹھے۔

ہر آدمی اپنے لئے کچھ چاہتا ہے اور دوسرے کے لئے کچھ، اور بلا شبہہ یہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

اداکاری

رشی کپور ایک مشہور فلم ایکٹر ہے۔ لنس آئی (Lens Eye) نے ایک صحافتی ملاقات میں رشی کپور سے پوچھا کہ کیا آپ اپنے موجودہ پیشہ سے مطمئن ہیں۔ اس کے جواب میں فلم ایکٹر نے کہا:

I can't say I'm satisfied. I'm fed up of being the lover boy. And everyone thinks that wretched instrument— the guitar—is a part of my body. I'm tired of being only a dancing-singing-jumping-smiling puppet.

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں مطمئن ہوں۔ عاشق کا کردار ادا کرتے کرتے میری طبیعت بھر گئی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کم بخت باجا —— ستار —— میرے جسم کا ایک حصہ ہے۔ میں اس سے اکتا گیا ہوں کہ میں صرف ناچنے، گانے، اچھلنے اور مسکرانے کی کٹھ پتلی بنا رہوں۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۵ جون ۱۹۸۳)

رشی کپور کے الفاظ اپنی برادری کے تمام لوگوں کے دل کے ترجمان ہیں۔ فلمی کردار سراسر ایک مصنوعی کردار ہے جو دوسرے شخص کی ہدایت کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا کٹھ پتلی جیسا کردار انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔ انسان ایک خود فکر مخلوق ہے۔ اس کا اندرون تقاضا کرتا ہے کہ وہ خود سوچے اور اپنے ارادہ کے تحت عمل کرے۔ مگر فلمی کردار اس شرط کو پورا نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ فلم کے اسٹیج پر کام کرنے والے لوگ اندر سے ہمیشہ اپنے بارہ میں غیر مطمئن رہتے ہیں۔

ایسی حالت میں جو لوگ فلم دیکھتے ہیں اور اس سے خوش ہوتے ہیں، وہ صرف اپنے سطحی ذوق کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اسٹیج پر جو شخص محبت کا کردار ادا کر رہا ہے وہ اندر سے بیزاری کی نفسیات لئے ہوئے ہے۔ جو شخص خوشی کا چہرہ بنا کر ان کے سامنے آیا ہے اس کے سینہ میں صرف ایک اداس دل چھپا ہوا ہے جس کو دیکھنے والے اس کو قابل رشک نظروں سے دیکھ رہے ہیں وہ خود اپنے بارہ میں بالکل غیر مطمئن ہے۔ اگر وہ ان باتوں کو جان لیں تو وہ سینما بینی سے بیزار ہو جائیں جس کو وہ تفریح سمجھ کر دیکھتے ہیں۔

اعلان

الرسالہ کے انگریزی اڈیشن کی تیاریاں جاری ہیں۔ اس کو ہر اعتبار سے معیاری بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ انشاء اللہ اس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۸۴ میں شائع ہوگا۔

منیجر الرسالہ

حقیقت کی دریافت میں ناکامی

کارل مارکس (۸۳-۱۸۱۸) فطرت سے غیر معمولی صلاحیت لے کر پیدا ہوا۔ جرمنی کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں اس نے ڈاکٹریٹ تک تعلیم حاصل کی۔ وہ آٹھ زبانیں جانتا تھا: یونانی، اطالوی، اسپینی، جرمن، انگریزی، فرانسیسی، ڈچ، فریشین۔ آخر عمر میں اس نے روسی زبان سیکھنا شروع کیا۔ مگر تکمیل سے پہلے اس کا انتقال ہوگیا۔ وہ ساری عمر پڑھتا رہا۔ تاریخ، اقتصادیات اور فلسفہ سے لیکر ادب اور مذہب تک کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس پر اس نے کافی مطالعہ نہ کیا ہو۔ اس نے لائبریریاں کی لائبریریاں اپنے ذہن میں اتار ڈالیں۔

مارکس کا یقین تھا کہ اس کی غیر معمولی ذہانت اور اس کے بے پناہ مطالعہ نے اس کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ زندگی کے راز کو منکشف کر سکے۔ مارکس کے رفیق خاص فریڈرش انگلس نے جہاں ہیگل پر تنقید کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"اگرچہ ہیگل اپنے وقت کا ایک بہت بڑا انسائیکلو پیڈیائی ذہن رکھنے والا آدمی تھا۔ تاہم وہ ایک محدود انسان تھا۔ اس کی محدودیت کی پہلی وجہ اس کی اپنی معلومات کی کمی تھی، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے زمانے کا علم اور اس وقت کے نظریات بھی محدود تھے، اس کے علاوہ ایک تیسرا سبب بھی تھا، وہ یہ کہ ہیگل ایک عینیت پسند (Idealist) شخص تھا۔ یعنی وہ مادے کے بجائے تصوّر کو اصل حقیقت سمجھتا تھا۔"[1]

انگلز نے لکھا ہے کہ ان اسباب کی بنا پر ہیگل کی تفصیلات سب کی سب غلط ہو کر رہ گئیں[1] اور حقیقت کی دریافت میں وہ ناکام رہا۔

انگلس کی یہ بات جو اس نے ہیگل کے بارے میں لکھی ہے، یہی خود مارکس پر بھی پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کے قانون کو اگرچہ تاریخ کا فیصلہ قرار دیتا ہے مگر اس کے باوجود اس کا کہنا ہے کہ اس قانون کو معلوم کر کے اسے استعمال کرنا خود انسان کا اپنا کام ہے۔ اس لئے عملاً اس کے یہاں بھی قانون ساز خود انسان ہی بن جاتا ہے۔ مارکس جب کہتا ہے کہ زندگی کا قانون خود زندگی کے اندر موجود ہے اس کو خارج میں کہیں سے برآمد کرنے کی ضرورت نہیں تو دراصل وہ اپنے آپ کو ان فلسفیوں

---

[1] مارکس انگلس سلکٹڈ ورکس جلد دوم (ماسکو ۱۹۴۹) صفحہ ۱۲۲

سے الگ کرنا چاہتا ہے جو انسان کو ایک خود فکر مخلوق مان کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اپنا قانون ساز آپ ہے۔ اس کے برعکس مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ جس طرح لوہے اور پتھر کے لئے الگ سے کوئی قانون بنانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اپنا قانون اپنے ساتھ رکھتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان بھی ایک قانون میں جکڑا ہوا ہے جس کو بنانا نہیں بلکہ دریافت کرنا ہے۔ مگر اس چھپے ہوئے قانون کو دریافت کرنے اور اس کو نافذ کرنے کا کام جب وہ خود انسان کے سپرد کرتا ہے تو ظاہری اختلاف کے باوجود وہ اپنے آپ کو انھیں فلسفیوں کے گروہ میں شامل کر دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ انسان خود اپنے لئے قانون بنا سکتا ہے۔ اس لئے وہ تنقید جو قسم اوّل کے فلسفیوں پر چسپاں ہوتی ہے ٹھیک وہی تنقید خود مارکس پر بھی چسپاں ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

انگلز نے اپنے اس تجزیے میں ہیگل کی ناکامی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس کا علم محدود تھا کیونکہ ایک شخص خواہ کتنا ہی وسیع مطالعہ رکھتا ہو مگر بہر حال وہ محدود ہی رہے گا۔ دوسرے یہ کہ تحصیل علم کے لئے اس کو جو زمانہ ملا وہ بھی ایسا زمانہ تھا جو اسے زیادہ معلومات نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود چونکہ ایک خاص طرز فکر رکھتا تھا اس لئے زیادہ وسیع ذہن کے ساتھ نتائج اخذ کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔ اگر انگلز کی اس تشریح کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ صرف ہیگل بلکہ تمام فلسفیوں کے نظریات کی تردید ہو جاتی ہے حتیٰ کہ خود مارکس کے فلسفہ کی بھی جس کو انگلس حقیقت کا صحیح ترین ترجمان مانتا ہے۔

پہلی چیز انسان کا اپنا علم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قانون دریافت کرنے کے لئے جس وسیع علم کی ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں انسان کا علم ہمیشہ محدود رہے گا۔ زندگی کے قانون کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام انسانوں کے لئے ہے جو روئے زمین پر بستے ہیں۔ کیا کوئی انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس نے تمام انسانوں کے جذبات کو پڑھا ہے اور ان کی ضروریات کو معلوم کر لیا ہے۔ آدمی بسا اوقات خود اپنے بارے میں کسی قطعی اور صحیح فیصلہ تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر وہ ان کروڑوں انسانوں کے بارے میں کیا جان سکتا ہے جن کی اس نے شکل تک نہیں دیکھی، جن کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ زندگی کا مسئلہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ جس طرح کسی مشین کا ایک پرزہ درست کرنے کے لئے اس کے تمام پرزوں سے واقفیت ضروری ہوتی ہے اسی طرح انسانی زندگی کے کسی ایک جزء کے لئے بھی وہی شخص قانون بنا سکتا ہے جو پوری زندگی کے مسائل پر عبور حاصل کر چکا ہو۔ کیا انسان اپنی موجودہ عمر اور موجودہ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ایسا کر سکتا ہے۔ ایک شخص جو بیک وقت دو خیالات پر غور نہیں

کرسکتا۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کروڑوں انسانوں کے لئے قانون بنا سکتا ہے، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں۔ ذہنی صلاحیتیں تو درکنار کیا چند سال کی یہ محدود عمر کسی کے لئے کافی ہوسکتی ہے کہ وہ زندگی کے مسائل کا جامعیت اور تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرسکے۔

مارکس کی زندگی کے آخری ۲۵ سال اس طرح گذرے ہیں کہ لندن میں برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں صبح کو وہ سب سے پہلے داخل ہوتا تھا اور شام کو سب سے آخر میں نکلتا تھا۔ مگر اس غیر معمولی جانفشانی کے باوجود اپنی عمر میں وہ اپنی کتاب "سرمایہ" کی صرف ایک جلد شائع کر سکا اور بقیہ جلدیں مکمل کرنے سے پہلے ایک روز اپنے مطالعہ کے کمرہ میں آرام کرسی پر بیٹھا بیٹھا انتقال کر گیا۔ اس کی یہ مشہور کتاب جو "محنت کش طبقہ کی بائبل" کہی جاتی ہے اس کی دوسری اور تیسری جلدیں جن کا مسودہ وہ ناتمام حالت میں چھوڑ گیا تھا اس کو انگلز اور کاٹسکی نے بعد کو مکمل کیا اور اس میں بہت دنوں تک کاٹ چھانٹ ہوتی رہی۔ پھر مارکس نے اپنی بہترین کوشش صرف کرنے کے بعد جو ناتمام حاصل مطالعہ چھوڑا ہے اس کا بھی یہ حال ہے کہ اس میں زیادہ تر صرف سرمایہ دارانہ اقتصادیات کی تشریح کی گئی ہے۔ مگر موجودہ نظام کو توڑ کر سوشلسٹ اقتصادیات کی تنظیم کس طرح ہوگی، اس پر توجہ دینے کا اسے بہت کم موقع ملا۔ مارکس کی تحریروں میں کہیں بھی اس نظام کی تفصیل نہیں ملتی جو سرمایہ داری نظام کے بعد آئے گا۔ حقیقت یہ کہ انسان کو جو صلاحیتیں دی گئی ہیں اور اس کو دنیا میں کام کرنے کے لئے جتنا وقت ملتا ہے اس کے تحت کوئی بھی انسان خواہ وہ کتنا ہی قابل ہو یہ کام نہیں کرسکتا۔ انسان کے لئے قانون بنانا انسان کے بس سے باہر ہے۔

دوسرے پہلو سے دیکھیے۔ آج جو قانون بنتا ہے وہ کل نافذ ہوتا ہے۔ مگر انسان کو کل کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ آدمی کی معلومات صرف ماضی اور حال کے واقعات تک محدود ہیں جب کہ اسے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔ مثال کے طور پر مارکسزم کا سارا انحصار ماضی کے تجزیے پر ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتی ہے اور یہی دیکھ سکتی ہے کہ جو کچھ آج ہے وہ کیوں کر وجود میں آیا اور اس کی نشوونما کس طرح ہوئی اور پھر اس تجزیے کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ مارکس اور اس کے متبعین کو اس طریقے کے مکمل ہونے پر اس قدر اصرار ہے گویا انھوں نے "آخری سچائی" کو پالیا ہے۔ حالانکہ مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ جس طرح تمام موجودات عمل ارتقا کے ذریعے وجود میں آتی ہیں اسی طرح انسانی سماج میں بھی ارتقائی عمل ہو رہا ہے اور پھر ڈارون کے نظریہ کے برعکس اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ارتقا کا یہ سفر لازمی طور پر تدریج اور تسلسل کے ساتھ نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس میں اچانک خلاف توقع تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہ نظریہ

خود اس بات کی تردید کر رہا ہے کہ کوئی شخص مستقبل کے بارے میں جان سکتا ہے۔ جب انسانی سماج کسی لگے بندھے ارتقائی نظریے کے مطابق سفر نہیں کر رہا ہے بلکہ بعض اوقات بالکل اچانک اس میں غیر متوقع تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں تو آئندہ کے بارے میں کوئی اصول کس طرح طے کیا جا سکتا ہے۔ پھر کس طرح یقین کیا جائے کہ ماضی کے بارے میں کسی شخص کا تجزیہ لازمی طور پر مستقبل کی بھی صحیح تشریح کرتا ہے۔ جو کچھ وجود میں آچکا ہے ان کے بارے میں کوئی سرپھرا سب کچھ جانتے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ مگر جو کچھ ابھی سرے سے وجود میں نہیں آیا ان کو کون جان سکتا ہے جب کہ مارکسی فلسفے کے مطابق ان کے لئے کوئی لگا بندھا اصول بھی نہیں ہے۔ جب کہ اکثر اوقات اندازے کے خلاف بھی اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

اب تیسری حیثیت سے دیکھیے۔ انگلز کے خیال میں ہیگل اس لئے حقیقت تک نہ پہنچ سکا کہ وہ "عینیت پسند" تھا۔ ٹھیک۔ یہی بات خود مارکس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ وہ اس لئے حقیقت تک نہیں پہنچ سکا کہ وہ "مادیت پسند" تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ بالکل تجریدی انداز میں حقائق کا مطالعہ کر سکے۔ ہر شخص کے کچھ مخصوص رجحانات ہوتے ہیں اور آدمی مجبور ہے کہ وہ جب بھی مسائل حیات کا مطالعہ کرے تو ان رجحانات سے مغلوب ہو جائے۔ اس طرح ہر آدمی کا مطالعہ جانب دار مطالعہ بن جاتا ہے اور اس کے فیصلے زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں، اس میں ایک فرد کے ذوق کی تسکین ہو سکتی ہے مگر مجموعی طور پر پورے معاشرے کے لئے وہ بالکل ناقابل قبول ہوتے ہیں۔

انسان کی ذاتی کیفیات کس طرح اس کے طرزِ فکر پر غالب ہو جاتی ہیں اس کی ایک دل چسپ مثال یہ ہے کہ مارکس کی کتاب "سرمایہ" کی پہلی جلد شائع ہو کر جب انگلز کے ہاتھ میں گئی تو اس نے اس کے پہلے دو ابواب پر جن میں جنس اور زر کا تجزیہ ہے اور جو تمام کتاب میں سب سے زیادہ صبر آزما اوراق سمجھے جاتے ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے مارکس کو لکھا:

"کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ ابواب اتنے لمبے ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کئی حصوں پر منقسم ہوتے اور ان کو زیادہ عام فہم بنا دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ جس زمانہ میں یہ ابواب لکھے جا رہے تھے، تمہیں سرطان کے پھوڑوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ تمہارے پھوڑوں کا وہی عذاب ان ابواب میں مقید ہو گیا ہے اور وہی کرب ہو بہو ان میں بھی بس گئی ہے۔"

مارکس نے اس تنقید کی تصدیق کرتے ہوئے جواب دیا:

"مجھے اس کا افسوس نہیں ہے بلکہ خوش ہوں کہ سرطان کے پھوڑوں کا عذاب ان میں محفوظ ہے کیونکہ میری یہ کتاب سرمایہ داروں کے طبقے میں جب جائے گی تو اس عذاب کا مزہ وہ بھی چکھ سکیں گے۔"

یہ صحیح ہے کہ ایک سرطان زدہ مصنف کی تحریر کو جو شخص پڑھے گا وہ اس کے اندر پھوڑوں کا تعفن اور ان کا کرب محسوس کر سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ تحریر کی خوبی نہیں بلکہ اس کا نقص ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تحریر ایک شخص کی ذہنی حالت کی ترجمان ہے نہ کہ حقیقت کی ترجمان۔

الہامی ہدایت

حقیقت یہ ہے کہ مادی دنیا اور انسانی دنیا دونوں کا دین ایک ہے۔ اور وہ قانون قدرت کی پیروی ہے۔ ایک ہی خالق نے دونوں کو پیدا کیا ہے اور وہی ہے جس نے دونوں کے لئے قانون عمل مقرر کیا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ مادی دنیا اپنا قانون اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ مادی دنیا کا قانون عمل خود اس کے اندر اس طرح پیوست ہوتی ہے کہ وہ لازمی طور پر اسی کے تحت عمل کرتی ہے۔ وہ کسی طرح اس سے باہر نہیں جا سکتی۔ مگر انسان ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو وہ کرنا چاہے۔ اور وہ نہیں کرتا جو وہ کرنا نہ چاہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان، دوسری چیزوں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا قانون اس کے ساتھ ہو۔ انسان کو اپنا قانون عمل علیحدہ سے دریافت کرنا ہے۔

مگر انسان جب بطور خود اپنا قانون عمل دریافت کرنا چاہتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو دریافت نہیں کر سکتا۔ انسان کی محدودیتیں (Limitations) فیصلہ کن طور پر اس کی راہ میں حائل ہیں۔

انسان کی یہی وہ کمی ہے جو اس کی زندگی کی تعمیر کے لئے "خدائی الہام" کو ضروری ثابت کرتی ہے۔ انسان جس قانون عمل کا حاجت مند ہے جب وہ اس کو دریافت نہیں کر سکتا تو اس کے بعد دوسری ممکن صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اس کو اس کے خالق کی طرف سے دی جائے۔ جو چیز دوسری مخلوقات کو اندرونی طور پر ملی ہوئی ہے وہ انسان کو بیرونی ذریعہ فراہم کی جائے۔

یہ بیرونی ذریعہ وہی ہے جس کو پیغمبر کہا جاتا ہے۔ انسان کی علمی محدودیت اس کو بیرونی ہدایت کا محتاج ثابت کرتی ہے۔ اور پیغمبر کی ہدایت کا عین انسانی طلب کے مطابق ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہی وہ بیرونی ہدایت ہے جس کی اسے ناگزیر طور پر ضرورت تھی

علم کافی نہیں

"پچاس سونے والے بہہ گئے ———" یہ خبر ایک مرتبہ اخبار میں چھپی۔ خبر میں ایک مقام پر بارش اور طوفان کی تفصیلات بتائی گئی تھیں اور اس میں کہا گیا تھا کہ پانی ریلوے لائن کے اوپر تک پہنچ گیا اور پچاس سونے والے بہہ گئے۔

خبر کچھ عجیب سی تھی۔ ذہن نے جاننا چاہا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ انگریزی اخبار دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اصل میں خبر تھی "پچاس سلیپر بہہ گئے"۔ یہی لفظ اردو اخبار میں ترجمہ کی غلطی سے "سونے والے" بن گیا۔ سلیپر (Sleeper) کے لفظی معنی بے شک سونے والے کے بھی ہیں۔ مگر اس خبر میں ظاہر ہے کہ یہ لفظ ریلوے لائن میں استعمال ہونے والے اس لکڑی کے کندے کے لئے تھا جس کے اوپر لوہے کی پٹریاں بچھائی جاتی ہیں نہ کہ سونے والے آدمی کے لئے۔

اس قسم کی غلطیاں کتنی ہی بار آپ کے سامنے آئی ہوں گی ان غلطیوں کا سبب ہمیشہ علم کی کمی ہوتا ہے۔ اور ان سے بچنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ آدمی علم حاصل کرلے۔ مگر غلطیوں کی ایک اور قسم، اس سے زیادہ سنگین قسم ہے جس کا تعلق علم سے نہیں معرفت سے ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کے لئے صرف صاحب علم ہونا کافی نہیں بلکہ حقیقت آشنا ہونا بھی ضروری ہے۔ جو شخص معرفت کی دولت سے محروم ہو وہ محض علم کی بدولت ان غلطیوں سے مامون نہیں رہ سکتا۔

معرفت کیا چیز ہے اور علم اور معرفت میں کیا فرق ہے، یہ ایک نہایت نازک سوال ہے۔ اجمالی طور پر ہم میں سے ہر شخص اس فرق کو سمجھتا ہے، مگر متعین تعریف کرنی ہو تو کسی ایک تعریف پر سب کا اتفاق حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تاہم سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علم کا مطلب ہے جاننا اور معرفت کا مطلب ہے پہچاننا۔ معرفت علم کی روشنی ہے۔ آنکھ اور روشنی میں جو نسبت ہے وہی نسبت علم اور معرفت میں ہے۔ اگر سرے سے روشنی نہ ہو تو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر روشنی موجود ہو مگر کم ہو تو اسی کے بقدر کم دکھائی دے گا جتنا روشنی میں کمی ہے۔ اس اعتبار سے معرفت حاصل ہونے اور معرفت حاصل نہ ہونے کے ہزار درجے بن جاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ کیڑے مکوڑے (Insects) ہماری ایک جانی بوجھی حقیقت ہیں۔ یہ نہایت کثرت سے انڈے بچے کرتے ہیں اور ان کے اندر بڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بھڑ کو اگر مسلسل زندہ رہنے اور نشو ونما پانے کا موقع ملے تو وہ شیر کی مانند جسامت حاصل

کر سکتی ہے۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے کیڑوں کی ہزاروں صورتیں اگر شیر اور بھیڑیئے کی طرح بڑی ہو کر چلنا پھرنا شروع کر دیں تو زمین پر انسان کے لئے زندگی گزارنا کس قدر مشکل ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیڑے مکوڑے اس قسم کے پھیپھڑے نہیں رکھتے جیسے کہ آدمی رکھتا ہے۔ وہ خاص طرح کی ہوائی نالیوں (Air Tubes) کے ذریعہ سانس لیتے ہیں۔ جب کیڑے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی یہ سانس کی نالیاں ان کے بڑھتے ہوئے جسم کی نسبت سے نہیں بڑھتیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا، زیادہ بڑا نہیں ہونے پاتا۔ بڑھنے پر یہ حد بندی ان کو شیر اور بھیڑیئے کی جسامت حاصل کرنے سے روکے رہتی ہے۔ اگر یہ قدرتی روک موجود نہ ہوتا تو زمین پر انسان کے لئے قیام کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اگر دل کے اندر ایمان کی معرفت موجود ہو تو یہ واقعہ خدا کے وجود پر آدمی کے یقین کو بڑھاتا ہے، وہ اس کے لئے خدا کی گواہی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عیسائی عالم کریسی مارلیسن (Cressy Morrison) اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عالم فطرت کا یہ نظم و نسق (Economy) ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کائنات کے پیچھے کوئی اعلیٰ ذہن کام کر رہا ہے، کیوں کہ:

Only infinite wisdom could have foreseen and prepared with such astute husbandry.

یعنی صرف لامحدود عقل اتنے زیرک انتظام کو پیشگی تصور میں لا سکتی تھی اور اس کا اہتمام کر سکتی تھی (ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۶۰ء)

مگر معرفت سے محروم ذہن کے لئے یہی واقعہ بالکل برعکس مفہوم کا حامل بن گیا۔ جولین ہکسلے (J. Huxley) اس زمانے کا بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں ارتقاء کے ذیل میں مذکورہ بالا واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور کیڑے مکوڑے کے فرق کو سمجھنے کے لئے کسی ارادۂ الٰہی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیڑے اور انسان دونوں ہی بعض سادہ اور ابتدائی جرثومۂ حیات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ انسان کو مخصوص اسباب سے زیادہ ترقی کرنے کا موقع ملا۔ اس لئے وہ ذہن و دماغ رکھنے والی ہستی بن گیا۔ اور کیڑے مکوڑوں کو بعض مانع اسباب نے یہ مواقع فراہم نہیں کئے، اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ لکھتا ہے:

"کیا چیز تھی جس نے کیڑوں کو ترقی کرنے سے روک دیا۔ اس کا جواب کیڑوں کے سانس لینے کے طریقے (Breathing Mechanism) میں چھپا ہوا ہے۔ زمینی کیڑوں نے سانس لینے کے لئے ہوائی ٹیوب کا طریقہ اپنایا ہے جس کو حیاتیاتی اصطلاح میں (Trachene) کہتے ہیں۔ اندر جا کر اس نالی کی نہایت چھوٹی چھوٹی شاخیں ہو جاتی ہیں جن کو صرف خوردبین کے ذریعہ دیکھا جا سکتا ہے۔۔ یہی

نالیاں گیسوں کو جسم کے اندر ٹشیج (Tissues) تک لے جاتی ہیں اور واپس لاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں انسان اور دیگر جانداروں میں دہرا طریقہ پایا جاتا ہے۔ یعنی گیسیں پھیپھڑے سے ہوکر خون کی نالیوں تک پہنچتی ہیں۔ گیسوں کے نفوذ و انتشار کا قانون کچھ ایسا ہے کہ نالیوں کے ذریعہ سانس لینا چھوٹے کیڑوں کے لئے تو بہت آسان رہتا ہے۔ مگر جسامت کے بڑھنے کے ساتھ وہ مشکل ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ چوہیا کے بقدر جسامت حاصل کرنے سے پہلے ہی یہ نالی ناقابل استعمال ہوجاتی ہے۔۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کیڑا کبھی دوسرے ریڑھ دار جانوروں کے لحاظ سے اوسط درجہ کی جسامت بھی حاصل نہ کرسکا" [1]

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ یہی سبب اس بات کا بھی ہے کہ کوئی کیڑا کبھی ذہین نہیں بنا۔ ایک خاص جسامت میں محدود ہونے کی وجہ سے کیڑوں کو بہت کم اعصابی ریشے درکار ہوتے ہیں جبکہ انسانی ذہانت حاصل کرنے کے لئے بہت کثیر مقدار میں اعصابی ریشوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اس طرح کے پھیلے ہوئے ریشوں کا نظام ایک خاص درجہ کی جسامت ہی میں پایا جاسکتا ہے۔ اب چونکہ کیڑے اس درجہ کی جسامت تک نہیں پہونچتے، اس لئے وہ اعلیٰ ذہانت بھی حاصل نہیں کرسکتے۔

دیکھیے۔ ایک ہی واقعہ کا علم ایک شخص کے لئے کائنات میں ایک ذہین تخلیقی ارادے کی موجودگی کا ثبوت بن گیا اور اسی واقعہ سے دوسرے شخص نے یہ پہلو نکال لیا کہ موجودات کی توجیہہ کے لئے کسی تخلیقی ارادے کو ماننے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کے بغیر ہم تمام موجودات کی توجیہہ کرسکتے ہیں۔ علم کی حد تک دونوں شخص یکساں ہیں۔ مگر معرفت کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کردیا۔

۲۔ انجیل کا ایک فقرہ ہے:

"تم زمین کے نمک ہو۔ لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔ پھر وہ کسی کام کا نہیں سوا اس کے کہ باہر پھینکا جائے اور آدمیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائے۔"

متی ۵ : ۱۳

اس فقرے میں دراصل بنی اسرائیل کے آخری نبی نے یہود کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ تم صاحب کتاب ہونے کی بناپر اہل دنیا کے لئے روشنی کا ذریعہ تھے۔ تمہاری حیثیت ہادی اور رہنما کی تھی۔ مگر تم نے کتاب الٰہی کو چھوڑکر اپنا مقام کھودیا اور اس طرح خود ہی اپنے کو اس کا مستحق بنالیا کہ دوسروں سے تمھیں ذلیل کیا جائے۔

---

[1] *Man in the Modern World (1955) p. 14*

مگر اس قانون الٰہی کو نہ جاننے کی وجہ سے ایک امریکی ماہر کیمیا (Elmer W. Maurer) نے اس کی عجیب وغریب تاویل کی ہے۔ وہ ایک کیمیا داں ہے۔ اس لئے اس نے علم کیمیا کی روشنی میں اس کو دیکھا تو اس کا ذہن ایک ادر ہی سمت میں چلا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ "تحقیق کے بعد میں اصل راز کو پا گیا۔"

" وہ یہ کہ رومی ارض مقدس کے رہنے والوں سے نمک بطور محصول وصول کرتے۔ اہل فلسطین کو نمک کی سب سے زیادہ یافت بحیرۂ مردار یا بحیرۂ نمک سے ہوتی۔ یہ محصول اتنے ظالمانہ تھے کہ لوگ نمک میں ریت کی آمیزش کرنے پر مجبور تھے۔ حکومت اس نمک کو پانی کے بڑے بڑے حوضوں میں ڈال دیتی۔ جب نمک پانی میں گھل جاتا تو نمکین پانی اوپر سے نکال لیا جاتا اور ملاوٹی مادہ ناقابل تحلیل ہونے کی وجہ سے تہ نشیں ہو کر حوض میں رہ جاتا۔ اس طرح نمک نے اپنا ذائقہ کھو دیا تھا۔ وہ اب نمک باقی نہیں رہا تھا، وہ اسی قابل تھا کہ پاؤں کے نیچے روندا جائے۔"

وہ مزید لکھتا ہے:

"یہی ایک طریقہ نہیں تھا جس سے نمک اپنا ذائقہ کھو دیتا۔ بحیرۂ مردار (Dead Sea) کی سطح کا پانی دیگر اجزار کے ساتھ ۳۱ فی صد سوڈیم کلورائڈ، ۱۲ فی صد کیلشیم کلورائڈ اور ۴۸ فی صد میگنیشم کلورائڈ رکھتا ہے۔ کیلشیم اور میگنیشم کلورائڈ ہوا سے پانی جذب کرنے کی خاصیت رکھتے ہیں اور اس بنا پر جب نمک کے ساتھ شامل ہوتے ہیں تو اسے تحلیل کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایک ناخوشگوار آمیزہ تیار ہو جاتا ہے۔ رواج تھا کہ لوگ اس قسم کے نمک کے بڑے بڑے ذخائر ان گھروں میں محفوظ کر لیتے جن کا فرش مٹی کا ہوتا۔ بعض اوقات زمین کے ساتھ نمک کی جو تہیں بیٹھ جاتیں، وہ نمی کی وجہ سے خراب ہو جاتیں۔ چونکہ یہ ذخیرہ نمک ملا ہوا ہونے کی وجہ سے زرخیز زمینوں کے لئے مضر ہوتا تھا اس لئے کوئی شخص بھی اسے کھیت میں پھینکنے کی اجازت نہ دیتا، اس بنا پر اسے صرف گلیوں ہی میں پھینکا جاتا جہاں چلنے والے لوگ اسے اپنے پاؤں کے نیچے روندتے۔"

The Evidence of God in an Expanding Universe
Edited by John Clover Monsma (N.Y.1958) p.205

انجیل کے فقرے کی یہ توجیہہ ظاہر ہے کہ لال بجھکڑ کی روایتی کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ نہ تو بجائے خود صحیح ہے اور نہ وہ متعلقہ فقرے پر کسی طرح منطبق ہوتی۔ مگر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے ایسی بچکانہ غلطی کا ارتکاب صرف اس لئے کیا کہ اس نے سائنس کا علم تو حاصل کیا تھا مگر دین کی حقیقتوں سے وہ ناآشنا تھا۔ وہ اس نمک سے واقف تھا جو علم کیمیا میں زیر بحث آتا ہے۔

اور لیبارٹری میں جس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ "نمک" کی ایک اور قسم ہے جس سے دل و دماغ کو چاشنی حاصل ہوتی ہے۔ جس سے زندگی میں خدا پرستی کا ذائقہ پیدا ہوتا ہے "نمک" کا لفظ دیکھ کر اس کا ذہن کیمیائی نمک کی طرف چلا گیا اور اپنے معروف نمک کے مطابق اس نے اس کی ایک تشریح کر ڈالی

اس کے باوجود اس کیمیا داں کو اپنے تصور پر اس قدر یقین ہے کہ اس کے بعد وہ لکھتا ہے:

"یہ صرف ایک نمونہ ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بائبل اپنی جزئی تفصیلات تک میں سائنسی طور پر بالکل صحیح ہے" (صفحہ ۳۰۵)

۳۔ ایک صاحب جو پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھتے ہیں، انھوں نے ریسرچ میں اپنے مقالہ کے لئے اسلام کے معاشی نظریات (The Economic Doctrines of Islam) کا عنوان لیا۔ ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کی اقتصادی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اپنے مقالے کے ایک حصے کو پر کرنے کے لئے انھیں یہ معلوم کرنا تھا کہ اسلام نے پیدائش دولت کے کن وسائل کی طرف اپنے پیروؤں کو متوجہ کیا ہے۔ اس مقصد سے انھوں نے قرآن کا مطالعہ کیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ یہاں تو بالکل لایغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا کا معاملہ ہے۔ پیدائش دولت کا کوئی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس کی طرف انھیں کتاب الٰہی میں "اشارہ" نہ مل گیا ہو۔

اس حیرت انگیز انکشاف کی بنیاد کیا تھی، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ قرآن میں موسیٰ اور فرعون کی کش مکش کے جو واقعات ہیں، ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جب فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا:

فاوقد لی یاھامان علی الطین فاجعل لی صرحا لعلی اطلع الی الٰہ موسٰی (قصص)	اے ہامان! مٹی کے گارے کو جلا اور میرے لئے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسیٰ کے خدا کو دیکھوں۔

اس آیت کو پڑھتے ہی موصوف اچھل پڑے۔ انھوں نے کہا، یہ تو ترابیاتی صنعت (Ceramic Industries) کی تعلیم ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس فقرے کا ترابیاتی صنعتوں کے قائم کرنے یا نہ کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو صرف فرعون کے تمرد کو بتا رہا ہے جو اس نے خدا کے نبی کے سامنے ظاہر کیا۔

اسی طرح جہاں کہیں کوئی ایک لفظ مل گیا، خواہ وہ جس سیاق میں بھی آیا ہو، انھوں نے فوراً

اس سے ایک معاشی مفہوم نکال لیا ——— ومامن دابة فی الارض ولاطائر یطیر بجناحیہ (انعام) ان کے نزدیک مرغبانی اور پرندپروری کی تعلیم دینے والی آیت تھی، واوحیٰ ربك الی النحل (نحل) شہد کی مکھیاں پالنے اور شہد کی تجارت کرنے کے ہم معنیٰ تھا، ولباسھم فیھا حریر میں کرم پروری اور سلک انڈسٹری کی طرف اشارہ تھا، ویصنع الفلك (ہود) جہاز سازی کا کارخانہ قائم کرنے کا پیغام تھا، وحلوا اساور من فضة (دہر) میں زیورسازی کی صنعت کی ہمت افزائی کی گئی تھی، اسی طرح محض "سرسری فہرست بندی" میں انھوں نے ۱۰۰ سے بھی زائد ایسی مصنوعات کا پتہ لگایا تھا جن کی طرف قرآن میں "اشارے" کئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ اس جوش میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ قرآن سے جن صنعتی کاموں کی فہرست وہ بنا رہے ہیں، ان میں اصنام، تماثیل، خمر اور صوامع جیسی چیزیں بھی شامل ہیں۔

مختلف قسم کی صنعتوں کو قائم کرنے اور ان کو فروغ دینے کے بارے میں اس قرآنی استدلال کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کو عربی الفاظ کے معانی کا علم تو تھا مگر قرآن کی حکمت سے وہ آشنا نہیں تھے۔ اس لئے انھیں محسوس نہیں ہوا کہ جن آیات کے حوالے سے وہ اپنا استدلال کھڑا کر رہے ہیں، ان آیات کا صنعت و تجارت کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ استدلال صریح طور پر قرآن کی روح کو مجروح کر رہا ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک مخصوص حلقہ میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات کے ایک پروفیسر نے اس کو عظیم تصنیف (Great Work) سے تعبیر کیا۔ اور کیمبرج یونیورسٹی کے انگریز پروفیسر (Mr Krenkow) نے لکھا:

The work is a diligent and scientific study.

یعنی یہ تصنیف محنت اور علمی مطالعہ کا ایک نمونہ ہے۔

۴۔ مشہور حدیث جبریل کا ایک فقرہ ہے:

الاحسان ان تعبد اللہ کانك تراہ فان لو تکن تراہ فانہ یراك [1]

کئی سال پہلے کی بات ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے اس فقرہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا،

---

[1] یہی مفہوم بعض دوسری روایات میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

ان تخشی اللہ کانك تراہ (تم اللہ سے اس طرح ڈرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو) فتح الباری جلد اوّل۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں کسی قسم کی رویت کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کی بندگی یہ سمجھ کر کی جائے کہ خدا جو علیم و بصیر ہے، وہ یقیناً ہم کو دیکھ رہا ہوگا۔ وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگر تم اسے دیکھ نہیں رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔

"جو لوگ حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں، انھوں نے خدا کو نہیں دیکھا، اگر وہ دیکھتے تو ایسا ترجمہ نہ کرتے" ——— یہ میرا جواب تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص خدا کا عینی مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کا مشاہدہ صرف آخرت میں ممکن ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بندہ جب خدا کی یاد اور اس سے خوف و محبت کے جذبات میں غرق ہوتا ہے تو اس پر شبہہ رویت کی سی ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے اور خدا کے درمیان محض ایک نظریاتی نسبت نہیں ہے بلکہ ایک گہرا فطری اور نفسیاتی ربط ہے۔ عام انسانوں میں یہ ربط چھپا رہتا ہے۔ مگر جو لوگ اپنے آپ کو خدا کے لئے وقف کر دیتے ہیں، ان کا یہ ربط اسی طرح ابھر آتا ہے جیسے دوسری فطری صلاحیتیں نکاس کا راستہ پانے کے بعد ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور ایسا نہ ہو تو دبی پڑی رہتی ہیں۔ بندہ جب اپنے آپ کو بالکل خدا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تو خدا بھی اس کے انتہائی قریب آجاتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان جو امکانی ربط ہے وہ بالفعل قائم ہو جاتا ہے۔

اس وقت خدا کا تصور آدمی کی فکر و نظر میں اس طرح سما جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس کو خدا کی یاد دلانے والی بن جاتی ہے۔ اس پر ایسے لمحات گزرتے ہیں جب خدا کے سوا اور کوئی چیز اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ وہ شوق و اشتیاق کے شدید جذبات کے ساتھ خدا کی طرف لپکنے لگتا ہے اس کو ایسی کیفیت سے بھری ہوئی دعائیں نصیب ہوتی ہیں جیسے کہ وہ عین اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہے۔ اس کو ایسے سجدے نصیب ہوتے ہیں جب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنا سر اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے اور اس کے آگے زمین پر پڑا ہوا ہے، اس کو ایسے اعمال کی توفیق ملتی ہے گویا کہ وہ عین خدا کے حضور میں ہے اور اس کی خوشنودی کے لئے سرگرم ہے ——— یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب بندگی اپنے انتہائی عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ اس وقت بندہ جسمانی اعتبار سے خدا سے دور ہونے کے باوجود، اپنے احساس کے اعتبار سے خدا کے قریب ہو جاتا ہے، نہ دیکھنے کے باوجود وہ خدا کو دیکھنے لگتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں عبادت کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔ پہلا اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بندے کے قلب و روح پر خدا کا خیال اس طرح چھا جائے کہ اس پر حضوری کی کیفیت طاری ہونے لگے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن میں اس تصور کو جمائے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور اسی تصور کے تحت خدا کی عبادت کرے۔ اسی لئے حدیث کے پہلے ٹکڑے میں "رویت" کی نسبت بندے کی طرف کی گئی ہے اور دوسرے ٹکڑے میں رویت کی نسبت خدا کی طرف۔ اس اعتبار سے فقرے کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کیا ہے۔ انھوں نے اس حدیث میں عبادت کے دو "مراتب" مراد لئے ہیں۔ ایک "اعلیٰ" اور دوسرا اس سے "فروتر" مرتبہ۔ اعلیٰ یہ کہ بندہ ——— در مشاہدۂ معبود و حضور ذات اقدس وے مستغرق باشد" اور اس سے فروتر مرتبہ "آگاہ بودن است از نظر الٰہی و علم وے تعالیٰ بحال بندہ" اس کے بعد انھوں نے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

احسان عبادت کردن است خدا تعالیٰ را چناں کہ گویا می بینی اورا، پس اگر نیستی تو بایں حال کہ گویا می بینی اورا، عبادت کن اورا بایں صفت کہ حاضر باشی ازیں کہ می بیند وے ترا دریں صورت

اشعۃ اللمعات، جلد اول، صفحہ ۳۵

احسان کا مطلب خدا کی عبادت اس طرح کرنا ہے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تمھاری یہ کیفیت نہ ہو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، تو تم اس طرح عبادت کرو کہ یہ خیال تمھارے ذہن میں موجود رہے کہ خدا تم کو عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

اشار فی الجواب الی حالتین: ارفعھما ان یغلب علیہ مشاھدۃ الحق بقلبہ حتی کانہ یراہ بعینہ والثانیۃ ان یستحضر ان الحق مطلع علیہ یریٰ کل ما یعمل

فتح الباری جلد اول، صفحہ ۱۱۱

"احسان کیا ہے" کے سوال کا جواب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے اس میں دو حالتوں کی طرف اشارہ فرمایا ان میں بلند حالت یہ ہے کہ عابد کے دل پر مشاہدۂ حق کا اس قدر غلبہ ہو گویا کہ وہ اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ رہا ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اس خیال کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھے کہ خدا اس سے باخبر ہے اور وہ اس کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اوپر جو چند مثالیں میں نے دیں، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ علم کے ساتھ معرفت کس قدر ضروری ہے۔ اگر معرفت یا دوسرے لفظوں میں اشیاء کی پہچان نہ پیدا ہوئی ہو اور آدمی کو ان حقیقتوں سے آشنا ہونے کا موقع نہ ملا ہو تو محض علم کافی نہیں ہو سکتا۔ ظاہری معلومات رکھنے کے باوجود آدمی

طرح طرح کی بے خبری میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے، مگر نہیں دیکھتا، وہ پڑھتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔

علم حقیقت میں وہی علم ہے جس کے ساتھ معرفت کی گہرائیاں شامل ہوں۔ جس نے "غم" کا لفظ ڈکشنری میں دیکھا ہو، مگر اس کو تڑپنا نصیب نہیں ہوا، وہ غم کا مطلب نہیں جانتا، ایسا شخص بس ترجمہ کرنے والی مشین ہے جو ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں دہرا دیتی ہے، مگر نہیں جانتی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ جس نے کتاب الٰہی میں لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ پڑھا، مگر قرآن نے خود اس کے اوپر نازل ہو کر اس کے دل کے ٹکڑے نہیں کیے، وہ نہیں جانتا کہ اس آیت میں کون سی حقیقت بتائی گئی ہے۔ جس نے اسلام کے معاشی قوانین پر عبور حاصل کر لیا، مگر اس پر ابھی ایسا معاشی واقعہ نہیں گذرا کہ وہ ایک صاحب حاجت کو اپنی جیب کے پیسے دے اور دوسری طرف اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں والذین یؤتون ما اتوا وقلوبھم وجلۃ کی تفسیر جھلک رہی ہو، اس وقت تک وہ اسلام کی معاشیات سے بے خبر ہے۔ جس شخص نے نماز کے مسائل جان لیے مگر نماز سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی نہیں ہوئیں، نماز اس کے لیے خدا سے سرگوشی نہیں بنی، وہ ابھی نماز سے ناآشنا ہے۔ جس نے حدیث کی کتابیں ختم کر ڈالیں، مگر اس کے آنسوؤں نے کتاب کے اوراق نم نہیں کیے، وہ حدیث کی حقیقت سے ناواقف ہے۔ جس کو دنیا نے اسلام کے مقرر کا خطاب دیا ہو، اس کی تقریر اس وقت تک اسلامی تقریر نہیں بنتی جب تک وہ خدا سے دعاؤں اور التجاؤں کے نتیجے میں نازل ہو۔ جن کو لوگ اسلام کے مصنف کی حیثیت سے جانتے ہوں، اس کی تصنیف اس وقت تک اسلامی تصنیف نہیں ہے جب تک اس پر یہ حالت نہ گزری ہو کہ وہ بے قرار ہو کر سجدے میں سر رکھ دے اور کہے کہ خدایا! تو میرا قلم بن جا جس سے میں لکھوں، تو میرا دماغ بن جا جس سے میں سوچوں۔

جاننے والو! جانو، کیوں کہ تم ابھی نہیں جانتے، پڑھنے والو! پڑھو، کیوں کہ تم نے ابھی نہیں پڑھا۔

اسلام اور انسانی مسائل

اسلام کی تعلیمات کے بنیادی طور پر دو حصے ہیں۔ ایک خدا سے متعلق، اور دوسرا بندوں سے متعلق۔ پہلی قسم کی تعلیمات کو عبادات کہا جاسکتا ہے اور دوسری قسم کی تعلیمات کو معاملات۔

عبادات سے متعلق اسلام کی جو تعلیمات ہیں وہ ناقابل تغیر ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کمی بیشی جائز نہیں جس چیز کو اسلام میں بدعت کہا گیا ہے (کلّ بدعة ضلالة و کلّ ضلالة فی النار) اس کا تعلق حقیقتاً انھیں اول الذکر حصۂ احکام سے ہے۔

مگر ثانی الذکر احکام (معاملات) کی نوعیت اس سے مختلف ہے۔ اس شعبہ میں ہم کو صرف بنیادی احکام دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہر دور کے حالات کے مطابق ہم ان احکام کو منطبق کرتے رہیں۔ اجتہاد کا تعلق اسی دوسرے حصہ احکام سے ہے۔ اجتہاد حقیقتہً بدلے ہوئے دنیوی حالات میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کا انطباق تلاش کرنے کا دوسرا نام ہے۔

دونوں قسم کی تعلیمات کا یہ فرق حدیث سے واضح ہے۔ چنانچہ عبادات سے متعلق احکام کے بارہ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ احدث فی امرنا ھذا ما لیس منا فھو ردّ (جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی نئی بات نکالے جو اس میں نہ ہو وہ قابل رد ہے۔)

دوسرے حصۂ احکام کی مختلف نوعیت تأبیر نخل کے واقعہ سے واضح ہے۔ پیغمبر اسلام ایک بار مدینہ کے باہر کھجوروں کے ایک باغ سے گذرے۔ وہاں کچھ لوگ درخت کے اوپر چڑھے ہوئے کچھ کر رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ لوگوں نے بتایا کہ ہم نر کو مادہ پر مار رہے ہیں۔ آپ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ چنانچہ وہ لوگ رک گئے۔ مگر یہ زرخیزی کا معاملہ تھا اور زرخیزی کے بغیر درختوں میں پھل نہیں آتے۔ چنانچہ اس سال کھجور کی پیداوار بہت کم ہوئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جب معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ویسا ہی کرو جیسا تم پہلے کرتے تھے۔ کیوں کہ تم اپنے دنیوی معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو۔ (انتم اعلم بامور دنیاکم)

ان دونوں روایات سے واضح طور پر ثابت ہے کہ عبادات کے معاملہ میں کوئی اجتہاد نہیں ہے مگر جہاں تک معاملات کا تعلق ہے ان میں اجتہاد اور انطباق کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔

مجھے اس مقالہ میں اسلامی احکام کے صرف دوسرے حصہ کے بارے میں گفتگو کرنی ہے۔ تاہم اس دوسرے حصے کے بھی دو الگ الگ پہلو ہیں۔ اس اعتبار سے زیر بحث موضوع کو دو حصوں میں تقسیم

کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسانی معاملات میں اسلام کے بنیادی نقطۂ نظر سے ہے۔ دوسرے حصہ کا تعلق اس بنیادی قانونی ڈھانچہ سے ہے جو اسلامی شریعت انسان کے مسائل کے حل کے لئے پیش کرتی ہے۔ یہاں میں اپنی گفتگو کو موضوع کے پہلے حصہ تک محدود رکھوں گا۔

قرآن میں ہے کہ حق اگر ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب میں فساد ہو جاتا (المومنون ۷۱)

تخلیق کے بارہ میں خدا کا منصوبہ ایک کامل منصوبہ ہے۔ انسان کے سوا بقیہ کائنات ٹھیک ٹھیک اسی خدائی منصوبہ پر چل رہی ہے۔ اس لئے بقیہ کائنات نہایت درست ہے، اس میں کہیں کوئی خرابی نہیں (الملک ۳) مگر انسان اپنے عمل کے لئے آزاد ہے۔ وہ حق کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی دنیا میں فساد برپا رہتا ہے۔ انسان کا بگاڑ دراصل انسان کی آزادی کی قیمت ہے۔

انسان کے مسائل کا حل اسلام کے نزدیک وہی ہے جو بقیہ کائنات کے مسائل کا حل ہے۔ انسان اپنی خواہش پر چلنے کے بجائے اسی حق پر چلے جس پر کائنات کی بقیہ تمام چیزیں چل رہی ہیں۔ ایسا کرتے ہی انسانی سماج میں وہی اصلاح اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی جو بقیہ کائنات میں بروقت موجود ہے۔

حق پر چلنا کیا ہے اور خواہش پر چلنا کیا۔ اس کی ایک مثال لیجئے جو قرآن میں ہے: سورج کے لئے ممکن نہیں کہ وہ چاند سے ٹکرا جائے اور نہ رات ایسا کر سکتی ہے کہ وہ دن سے آگے بڑھ جائے۔ ہر ایک اپنے مدار میں گردش کرتا ہے (یٰسین ۴۰)

خدا کے منصوبہ کے مطابق خدا کا قانون ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں چلے۔ اسی کے مطابق تمام فلکیاتی اجرام حرکت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درمیان آپس میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اس حق کا اطلاق انسان پر اس طرح ہوگا کہ آدمی اپنے اپنے دائرہ میں عمل کرے۔ اگر ہر آدمی ایسا کرے تو پورے سماج کا نظام درست رہے گا۔ اس کے برعکس اگر ہر آدمی اپنی خواہش پر چلنے لگے تو لوگوں میں ٹکراؤ ہوگا اور سوسائٹی میں اور بین اقوامی زندگی میں فساد برپا ہو جائے گا۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ جب بیرونی سیاسی غلبہ سے آزاد ہوا تو ایک امریکی اپنے گھر سے باہر نکلا وہ سڑک پر آزادانہ طور پر چل رہا تھا۔ دوسرے راہ گیروں کا لحاظ کئے بغیر وہ اپنا ہاتھ زور زور سے ہلا رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس کا ہاتھ ایک راہ گیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔

راہ گیر نے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم اس طرح اپنا ہاتھ بے ڈھنگے طور پر ہلاتے ہوئے کیوں چل رہے ہو، امریکی نے جواب دیا کہ اب ہمارے ملک نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ آج میں

آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں اور جس طرح چاہوں چلوں۔ راہ گیر نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا: جناب، آپ کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے۔

Your freedom ends where my nose begins

قرآن میں ارشاد ہوا ہے، تم ناپ اور تول کو پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو (الاعراف ۸۵)

اس آیت کے مطابق خدا کی بنائی ہوئی زمین ایک اصلاح یافتہ زمین ہے۔ یہاں ہر چیز درست طریقہ پر قائم ہے۔ ہر چیز عین وہی کر رہی ہے جو اسے کرنا چاہئے۔ زمین کا یہ نظام انسان کے لئے اپنے معاملات کا معیار اور پیمانہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ اپنے عمل کو اسی قدرتی پیمانہ سے ناپے اور اس سے مطابق کر کے اپنے ہر عمل کو درست کرتا رہے۔ اگر انسان ایسا کرے گا تو اس کی سوسائٹی امن اور انصاف کی سوسائٹی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر وہ زمین میں رکھے ہوئے اس پیمانہ سے مطابقت نہیں کرے گا تو انسان کا سماج بگڑ جائے گا۔ وہ اصلاح کی دنیا میں فساد کی دنیا بنانے کے ہم معنی ہوگا۔

فطرت سے یہ مطابقت ہی ہماری تمام کامیابیوں کا راز ہے۔ موجودہ زمانہ کی ٹکنکل ترقیوں کو دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ مگر یہ ٹکنکل ترقیاں کیا ہیں۔ وہ فطرت سے مطابقت کا دوسرا نام ہیں۔ یہی طریقہ ہم کو انسانی سماج کی اصلاح کے لئے بھی اختیار کرنا ہے۔ مادی ترقیاں فطرت سے مطابقت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح انسانی سوسائٹی بھی نیچر سے مطابقت ہی کے ذریعہ درست ہوگی۔ خدا کی اس دنیا میں اصلاح و ترقی کا ایک ہی یقینی طریقہ ہے، اور وہ فطرت سے مطابقت ہے۔ مادی دنیا کے لئے بھی اور انسانی دنیا کے لئے بھی۔

ستاروں اور سیاروں کی گردش میں جو نظم ہے وہی نظم کائنات کی تمام چیزوں میں کمال درجہ میں پایا جاتا ہے۔ اس دنیا کے تمام واقعات اتنے منظم طور پر ظہور میں آتے ہیں کہ ان کو پیشگی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کائنات کی ناقابل بیان حد تک حیرت انگیز تنظیم اتنی کامل ہے کہ وہ اپنی فطرت میں قابل پیشینگوئی بن گئی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات انتہائی حد تک مکمل ہے۔ اس میں ابدیت، معنویت اور حسن کمال طور پر پایا جاتا ہے۔ وہ نقص یا کمی سے اتنا زیادہ خالی ہے کہ اس پر اربوں سال گزر گئے اور اس میں کسی نظر ثانی کی ضرورت پیدا نہیں ہوئی۔

موجودہ زمانے میں سائنس نے اس قانون فطرت کو بہت بڑے پیمانے پر انسانی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ مادی دنیا میں قوانین فطرت کا انطباق کیا گیا تو اس کے حیرت انگیز نتائج

برآمد ہوئے۔ دھات بجلی کی روشنی میں تبدیل ہوگئی۔ جامد مادہ حرکت بن کر دوڑنے لگا، مادہ شاندار تمدن میں ڈھل گیا وغیرہ ——— مگر یہی اصول کو انسان خود اپنی زندگی میں اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہی تضاد انسان کے تمام مسائل کی جڑ ہے۔ انسان جس سائنس (علم فطرت) کو میکینکل دنیا میں کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہا ہے اسی سائنس کو وہ انسانی دنیا میں استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ضرورت ہے کہ یہی آفاقی اصول انسانی زندگی میں بھی رائج ہوں۔ انسان بھی سوسائٹی کے اندر اسی طرح عمل کرے کہ ہر ایک اپنے دائرہ میں رہے، کوئی شخص دوسرے کے دائرہ میں داخل نہ ہو۔ انسان اپنی فطرت میں چھپے ہوئے تعمیری امکانات کو واقعہ بنائے۔ وہ اپنی زندگی کو اس طرح منظم کرے کہ وہ قابل پیشینگوئی کردار کا مالک بن جائے جس طرح بقیہ کائنات قابل پیشین گوئی کردار کی مالک بنی ہوئی ہے۔

..یہی انسان کا سب سے بڑا مقصود ہے اور یہی اصلاً تمام مذاہب کا خلاصہ ہے۔ پھر یہی اسلام کا خلاصہ بھی ہے جو آسمانی مذہب کا صحیح اور مستند اڈیشن ہے۔ اسلام حقیقتاً اس بات کی دعوت ہے کہ انسان اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے کائناتی نظام کو اپنا ماڈل بنائے۔ وہ اسی طرح زندگی گزارے جس طرح بقیہ وسیع کائنات کے تمام اجزاء اپنا اپنا وظیفہ پورا کر رہے ہیں۔

طبیعیاتی مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اور وہ انتہائی لزوم کے ساتھ اس پر قائم ہے۔ پروفیسر آئن رکسبرگ (لندن) کے الفاظ میں :

"کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کئے گئے ہیں وہ حکمی اعداد پر مشتمل ہیں، جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہ تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے حکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لئے ان اعداد میں وہی متناسب تعدد ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں (سنڈے ٹائمس، لندن، ۴ دسمبر ۱۹۷۷)

یہ سائنس کی زبان میں وہی بات ہے جو قرآن کی زبان میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر ہر چیز کا الگ الگ اندازہ مقرر کیا (الفرقان ۲) قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: کیا وہ خدا کے دین کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں حالانکہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں اسی کی مطیع ہیں، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ اور سب کو آخر کار خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

جس چیز کو سائنس میں قانون قدرت کہا جاتا ہے اسی کا مذہبی نام دین ہے۔ اللہ کا جو دین عملاً زمین و آسمان کی تمام چیزوں پر قائم ہے۔ وہی دین انسان سے بھی مطلوب ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بقیہ کائنات اس دین خدا پر جبر کے ذریعہ قائم ہے اور انسان کو یہ دین خود اپنے اختیار سے اپنے اوپر قائم کرنا ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

اور خدا نے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا۔ ہر ایک معین وقت پر چلتا ہے۔ اللہ معاملہ کی تدبیر کر رہا ہے اور وہ نشانیوں کو بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرو (الرعد ۲)

اس آیت میں تدبیر امر سے مراد کائنات کا خدائی نظام ہے۔ اور تفصیل آیات سے مراد وہ وحی ہے جو پیغمبروں پر اتری۔ خدا اپنے قانون کو بقیہ دنیا میں براہ راست اپنے نظام کے تحت عملاً قائم کئے ہوئے ہے۔ اسی قانون کو وہ پیغمبروں کے ذریعہ انسان کے پاس بھیجتا ہے تاکہ انسان اپنی آزاد مرضی سے اسی قانون الٰہی پر عمل کرے۔ گویا آسمانی کتاب (قرآن) جس حقیقت ربانی کا لفظی بیان ہے، کائنات اسی کا عملی مظاہرہ ہے۔

یہی بات ہے جو حضرت مسیح کی زبان سے انجیل میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے: پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ، تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو (متی ۶: ۱۰)

اینٹون چیخوف (۱۹۰۴ - ۱۸۶۰) نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ دنیا بے حد حسین ہے۔ اس میں صرف ایک ہی چیز ہے جو حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی دشمن نہیں، ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن بنتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں بارش برستی ہے تاکہ زمین پر فصل اگے، وہاں آدمی آگ برساتا ہے تاکہ فصلیں تباہ ہوں۔ ایک ایسی دنیا جہاں ہر طرف اصلاح کا منظر دکھائی دیتا ہے، وہاں انسان فساد اور بگاڑ پیدا کرتا ہے۔

دو دنیاؤں میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا پوری طرح خالق کے نقشہ کے مطابق چل رہی ہے، وہ ویسے ہی رہنے کے لئے مجبور ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ رہے۔ مگر انسان کو اللہ کی طرف سے آزادی ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارادے کے تحت ایک یا دوسرے راستے پر چلنے کا اختیار رکھتا ہے۔ انسانی دنیا میں بگاڑ کی وجہ تمام تر یہی ہے۔ بقیہ دنیا خدا کے نقشہ کی پابند ہے۔ اس لئے وہ مکمل طور پر درست ہے۔ اس کے برعکس انسان خدا کے نقشہ سے انحراف کرتا ہے۔ اس لئے اس کے سارے معاملات میں بگاڑ پایا جا رہا ہے۔ ہر برائی جو زمین پر پائی جاتی ہے وہ دراصل انسانی آزادی کا غلط استعمال ہے۔

سائنس کیا ہے؟ سائنس قانون فطرت کا استعمال ہے۔ سائنس مادہ کو تمدن میں تبدیل کرتی ہے۔ اسی طرح مذہب انسانی زندگی کو معیاری سماج میں تبدیل کرنے کا علم ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہب (اسلام) زندگی کی سائنس ہے۔ بقیہ چیزوں میں یہ سائنس مادہ کے جبری قانون کے تحت عمل کرتی ہے۔ اور انسان خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو اس قانون فطرت کا پابند بناتا ہے۔

سائنس کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع وہ ہے جس کو قدرت کی نقل کہتے ہیں۔ اس کا مقصد قدرت کے نظاموں کو سمجھ کر ان کی میکینکل نقل کرنا ہے۔ اس سائنسی شاخ کا نام (Bionics) ہے۔ مثلاً کشتی مچھلی کی نقل ہے۔ ہوائی جہاز چڑیا کی نقل ہے۔ کیمرہ آنکھ کی میکنیکل نقل ہے۔ کمپوٹر انسانی دماغ کی میکنیکل نقل ہے وغیرہ وغیرہ۔ قدرت کے ماڈل کو ہم اپنی میکنیکل دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ اسلام کا پیغام یہ ہے کہ قدرت کے اسی ماڈل کو انسانی زندگی کے نظام میں بھی منطبق کیا جائے۔ کائنات کا جو علم ہمیں جدید شہروں کی تعمیر کا فن بتاتا ہے وہی علم ہمیں سماجی تعمیر کے اصول بھی دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی تنظیم کے لئے تمام ضروری ماڈل کائنات میں موجود ہیں۔ البتہ چوں کہ انسان کو عمل کی آزادی دی گئی ہے اور وہ اس امتحان کی حالت میں ہے کہ وہ اپنی آزادی کو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط۔ اس لئے یہ تمام ماڈل تمثیلی انداز میں قائم کئے گئے ہیں۔

یہاں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ تمثیل کو واقعہ کے روپ میں دیکھے۔ انسان کو یہ ثبوت دینا ہے کہ وہ کائنات میں خالق کے خاموش کلام کو سن سکتا ہے۔ وہ قدرت کے اشاروں کو الفاظ کا روپ دے سکتا ہے۔ وہ تمثیلی ماڈل کو سمجھ کر اپنی حقیقی زندگی میں عملاً استعمال کر سکتا ہے۔ انسان کو اپنے آزادانہ ارادہ کے تحت وہی کچھ کرنا ہے جو بقیہ چیزیں مجبورانہ نظام کے تحت کر رہی ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں کائناتی ماڈل کی ایک مثال وہ ہے جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ یعنی کائنات میں بے شمار اجرام (Bodies) ہیں۔ اور سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر سب اپنے اپنے مدار کا پابند ہو کر حرکت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے مقرر دائرہ سے باہر نہیں جاتا۔ اسی لئے ان کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ فلکیات داں کہتے ہیں کہ بعض اوقات ایک پورا کہکشانی نظام اپنے اربوں ستاروں کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دوسرے کہکشانی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اس سے گذر کر باہر نکل جاتا ہے بغیر اس کے کہ دونوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ ہو۔

یہ ایک ماڈل ہے جو بتاتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کا سفر اس طرح جاری کرنا چاہیے کہ ایک اور دوسرے کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ نہ ہو۔ حتیٰ کہ ایک قوم (انسانوں کا مجموعہ)، دوسری قوم

سے ملے اور گذر جائے۔ مگر دونوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے ـــــ ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون (الشعراء ۱۵۲)

۲ - اسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جو شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی شکل میں قائم ہے۔ شہد کی مکھیوں کے چھتہ میں نہایت کامیاب قسم کی ایک منظم اسٹیٹ ہوتی ہے۔ اس اسٹیٹ کا نظام ایک ملکہ مکھی کے تحت عمل کرتا ہے۔ تمام مکھیاں حد درجہ محنت اور نظم کے ساتھ اپنی اپنی ڈیوٹی پر لگی رہتی ہیں۔ شہد کی مکھی کے چھتہ کے اندر نہایت معیاری قسم کی (Result-oriented) سرگرمیاں رات دن جاری رہتی ہیں۔

یہ ایک نمونہ ہے جو بتاتا ہے کہ انسانی سماج کی تنظیم کو کن اصولوں پر کام کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ تمام انسان ایک واحد نظام کے تابع ہوں۔ ایک خدا کی فرماں برداری میں ہر آدمی اور بحیثیت مجموعی پورا سماج اپنی اپنی ڈیوٹی کو پوری طرح انجام دے۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (آل عمران ۱۰۳)

۳- اسی طرح ایک ماڈل وہ ہے جو درخت کی صورت میں قائم ہے۔ انسان سانس لیتا ہے وہ ہر سانس میں ہوا سے آکسیجن لیتا ہے اور کاربن خارج کرتا ہے۔ اسی طرح درخت بھی سانس لیتے ہیں مگر ان کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ وہ فضا سے کاربن لے کر آکسیجن خارج کرتے رہتے ہیں۔ اگر درخت بھی وہی کریں جو انسان کرتا ہے تو ساری فضا کاربن سے بھر جائے اور انسان کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔

یہ ماڈل انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کو دوسرے کی طرف سے شکایت پہنچے تو وہ اس کو برداشت کرے، وہ تلخ کلمہ سن کر میٹھے الفاظ میں اس کا جواب دے۔ وہ برے سلوک کا تجربہ کرنے کے بعد اچھے سلوک میں اس کا ردّ عمل ظاہر کرے۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں۔

اسی چیز کو پیغمبر اسلام نے دوسرے موقع پر ان لفظوں میں بیان فرمایا: تخلقوا باخلاق اللہ (خدا کی اخلاقیات کو اختیار کرو) خدا کی اخلاقیات وہی ہیں۔ جو اس نے اپنی مخلوقات کی دنیا میں عملاً قائم کر رکھا ہے۔ اسی خدائی اخلاقیات کو انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ جو اخلاقیات بقیہ دنیا میں خدا کے اپنے زور پر قائم ہیں، اسی اخلاقیات کو انسانی دنیا میں خود انسان کے اپنے ارادہ

سے قائم کرنا ہے۔ یہی خدا کا اتارا ہوا مذہب ہے اور یہی اسلام ہے اور اسی میں انسانیت کے تمام مسائل کا حل چھپا ہوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکمت اور معنویت کا جو واقعہ وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنٹرول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے، وہی واقعہ انسان کو اپنی ذاتی زندگی میں ذاتی کنٹرول کے تحت وجود میں لانا ہے۔ جو واقعہ خدا نے بقیہ دنیا میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے۔ اسی کو انسانی دنیا میں انسان کی سطح پر قائم کرنا ہے۔

کائناتی سطح پر جو چیز لوہا کی شکل میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز پتھر ملی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز قابل پیشین گوئی کردار کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد (وعدہ پورا کرنا) کی صورت میں مطلوب ہے۔ کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر اچھے سلوک اور خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ درخت خراب ہوا (کاربن) کو لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اچھی ہوا (آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔ یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو"، کائنات میں کوئی چیز کسی دوسرے کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا اپنا حصہ ادا کرنے میں مصروف ہے۔ یہی چیز انسانی سطح پر اس طرح مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی نوعیت کی کارروائیوں سے وہ مکمل طور پر پرہیز کرے۔ کائنات میں (Recycle) اور (Decompose) کا اصول کارفرما ہے۔ فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لئے گیس میں تبدیل کر دئے جاتے ہیں۔ پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔ یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کی خرچ کی ہوئی دولت دوبارہ انسان کے لئے مفید بنے۔ ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے پھل کا تحفہ دے۔ کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار کام ہو رہے ہیں۔ ہر جز انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔ مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔ مگر یہی چیز انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے، بغیر اس کے کہ دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔ اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔ یہی چیز

انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔ کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان سے یہ ربانی اخلاقیات کیوں مطلوب ہیں، اور کیوں ایسا ہوا ہے کہ اس کے لئے خدا نے اپنی کتاب (قرآن) بھیجی اور کائنات میں بہت بڑے پیمانے پر اس کے عملی مظاہرہ کا انتظام کیا تاکہ آدمی خدا کی کتاب میں جس چیز کو پڑھے اس کو عملی نمونہ کی صورت میں اپنے باہر دیکھ لے اور اس پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔ اس کو سمجھنے کے لئے خدا کی اسکیم کو سمجھنا پڑے گا جس کی خاطر یہ ساری دنیا بنائی گئی ہے۔

خدا نے انسان کے لئے ایک ابدی جنت بنائی جو ہر قسم کی محدودیتوں اور کمیوں سے خالی ہے۔ جہاں انسان کو یہ موقع ملے گا کہ وہ ہر قسم کے دکھ اور تکلیف سے آزاد ہو کر ہمیشہ ہمیش کے لئے زندگی گذارے۔ مذکورہ اخلاقیات دراصل اسی جنت کے باسیوں کی اخلاقیات ہیں، جو لوگ ان اعلیٰ اخلاقیات کا ثبوت دیں گے وہی اس قابل ٹھہریں گے کہ ان کو جنت کے اعلیٰ ماحول میں بسایا جائے۔

ہر انسان ایک بہتر دنیا کی تلاش میں ہے، ایک ایسی دنیا جہاں وہ اپنی کمیوں کی تلافی کر سکے جہاں وہ ہر قسم کی خوشیوں اور لذتوں کو ابدی طور پر حاصل کر سکے۔ یہ ہر انسان کا مطلوب ہے۔ مگر ہر انسان اپنے مطلوب کو غلط مقام پر تلاش کر رہا ہے۔ جو چیز موت کے بعد کی زندگی میں رکھی گئی ہے اس کو وہ موت سے پہلے کی زندگی میں حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ایک کسان اگر اپنے لئے کوئی فصل اگانا چاہتا ہے تو وہ کائنات کے انتظام سے مطابقت کر کے ہی ایسا کر سکتا ہے۔ ایک انجینئر اگر ایک کارخانہ بنانا چاہتا ہے تو وہ اپنے منصوبہ میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب کہ وہ قوانین فطرت کو جان کر اسے استعمال کرے۔ ایسا ہی معاملہ انسانی زندگی کی تعمیر کا بھی ہے۔ انسان اگر اپنے لئے ایک پر مسرت اور کامیاب زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو وہ خدائی اسکیم سے مطابقت کر کے ہی اپنے لئے پا سکتا ہے۔ خدا کی اسکیم یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آدمی جنتی کردار کا ثبوت دے تاکہ اس کو مستقل طور پر جنت کی حسین اور لذیذ دنیا میں بسایا جائے۔ جو چیز آج ہے وہ کل نہیں مل سکتی۔ اور جو چیز کل ملنے والی ہے اس کو آج پانے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ انھیں دو لفظوں میں زندگی کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔

نوٹ: یہ اس انگریزی مقالہ کا اردو ترجمہ ہے جو کہ بین اسلامک کانفرنس (باربیڈوز) میں ۲ اپریل ۱۹۸۲ کو پڑھا گیا۔

ایک سفر

۱۹ دسمبر ۱۹۸۲ کی صبح کو میں ایرانڈیا کے جہاز کے ذریعہ دہلی سے طرابلس کے لئے روانہ ہوا۔ پالم ایرپورٹ پر ہم لوگ پہنچے تو سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری (مختار محمد الامشری) الوداع کہنے کے لئے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ موصوف پورے معنوں میں ایک عرب نوجوان ہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک ان سے دینی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ وہ ہندستان آنے سے پہلے میری عربی کتابیں پڑھ چکے تھے، اس لئے گفتگو کا بڑا حصہ انھیں کتابوں سے متعلق رہا۔

ساتھیوں سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو کچھ ہندستانی مسافر ملکی سیاست کے بارہ میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے جوش کے ساتھ کہا، "چرن سنگھ، جگجیون رام، مرارجی ڈیسائی، کوئی بھی سیاست نہیں جانتا سیاست اندرا گاندھی جانتی ہے، وہ تو کھا جائے گی پاکستان کو" اسی قسم کی باتیں ناموں کی تبدیلی کے ساتھ آپ کو سرحد کی دوسری طرف بھی سننے کو ملیں گی۔ دونوں ملکوں میں دوسرے کی تخریب کا نام سیاست ہے۔ اپنی تعمیر کا نام سیاست ہے، اس کو دونوں میں سے کسی نے ابھی تک نہیں جانا۔

ہمارے جہاز کے بیشتر مسافر یورپ جا رہے تھے۔ ان کی اکثریت غالباً ان ہندستانیوں پر مشتمل تھی جو یورپ میں مقیم ہیں اور ایشیائی کھیل دیکھنے کے لئے ہندستان آئے تھے۔ ان کے چہرے بے فکری کی علامت بنے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بار بار قہقہے لگاتے تھے۔ میرے دل نے کہا: انسان کی بے خبری بھی کس قدر عجیب ہے۔ لوگ ہنس رہے ہیں حالانکہ بہت جلد وہ روئیں گے۔ لوگ بول رہے ہیں حالانکہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ان کے الفاظ ختم ہو جائیں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں حالانکہ بالآخر خندق کے سوا کوئی چیز نہیں جو لوگوں کا انتظار کر رہی ہو۔ یہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے مگر یہی وہ حقیقت ہے جس کا نہ کوئی جاننے والا ہے اور نہ کوئی اس کو بتانے والا۔

دہلی سے اڑان کے بعد جہاز تقریباً نو گھنٹے تک چلتا رہا، یہاں تک وہ ساڑھے سات ہزار کلو میٹر کا سفر طے کر کے روم (اٹلی) پہنچا۔ اس درمیان میں جہاز کا اناؤنسر بار بار اعلان کرتا رہا ——— "اب ہم شام کے اوپر سے اڑ رہے ہیں۔ اب ہم یونان پہنچیں گے۔ اب ہم

اٹلی کی فضا میں داخل ہو گئے " زمینی سواری کے لئے بار بار راستے کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اتنا طویل سفر مسلسل جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ مگر خدا نے فضا کی صورت میں انسان کو ایسی کھلی سڑک دے دی ہے جہاں تمام رکاوٹوں سے بلند ہو کر انسان برابر اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔ اس واضح نشانی کے باوجود بہت سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ " زمینی " رکاوٹوں میں الجھے رہتے ہیں۔ ان میں یہ حوصلہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ " فضا " میں بلند ہو کر اپنی زندگی کے سفر کے لئے بلا رکاوٹ میدان حاصل کر لیں۔

ہوائی جہاز میں مطالعہ کے لئے رسالے دئے جاتے ہیں جن کو اصطلاح میں اندرون پرواز رسالہ (Inflight Magazine) کہا جاتا ہے۔ ایر انڈیا میں اس قسم کا دو ماہی انگریزی میگزین مسافروں کو فراہم کیا جاتا ہے جس کا نام نمسکار ہے۔ اس کے شمارہ دسمبر ۸۲ جنوری ۸۳ میں فلم " گاندھی " پر ایک مضمون تھا۔ اس کے ساتھ بن کنگسلے (Ben Kingsley) کی کئی تصویریں مہاتما گاندھی کے روپ میں تھیں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مذکورہ فلم میں گاندھی کا کردار ادا کیا ہے۔

یہ خوبصورت میگزین ہانگ کانگ میں ٹامسن پریس نے چھاپا ہے۔ جس جہاز (Boing 747) میں ہم اڑ رہے وہ امریکہ کا بنا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ملک کے باپو کی فلم بنانے کے لئے موزوں ترین ایکٹر اور ڈائرکٹر بھی مغرب میں ملے ہیں ــــــ کیسی عجیب ہے ہندستان کی ترقی اور کیسی عجیب ہے اس کی پس ماندگی۔

ایر انڈیا کے اس میگزین میں مسٹر آہوجہ کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے جو انھوں نے فلم "گاندھی" کے فلم ساز (Sir Richard Attenborough) سے لیا تھا۔ سر رچرڈ اٹن برونے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ کہانی بتاتے ہوئے اس کی ساری بات نہیں کہی جا سکتی۔ فلم گاندھی میں مہاتما کی زندگی کے ابتدائی ۳۰ سال نہیں ہوں گے اور یقیناً فلم میں کچھ ڈرامائی واقعات بھی ہوں گے:

> While telling a story you cannot relate everything. The first 30 years of the Mahatma's life will not be there, and the film must have some dramatic form.

فلم ساز تاریخ میں جو تصرف کرتا ہے وہی اکثر مورخ اور مفکر بھی کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ فلم ساز بتا کر کرتا ہے اور مورخ اور مفکر بغیر بتائے ہوئے۔

انگریزی حکومت نے گجرات میں نمک بنانے کی صنعت کو سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ اس پر

گاندھی جی نے مشہور ڈانڈی مارچ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دو ہزار آدمیوں کو لے کر ساحل پر جائیں اور نمک بنا کر سرکاری حکم کی خلاف ورزی کریں۔ اس موقع ایک انگریز افسر نے کہا تھا:

Let him make his salt, Mr. Gandhi will have to find a great more than a pinch of salt to bring down the British Empire.

ان کو اپنا نمک بنانے دو۔ مسٹر گاندھی کو چٹکی بھر نمک سے بہت زیادہ بڑی چیز درکار ہوگی کہ وہ برطانی شہنشاہیت کو مغلوب کر سکیں۔

اسی طرح گاندھی جی نے جب چرخا چلایا تو ان کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر یہ گاندھی کی بہت گہری تدبیر تھی۔ سیاست کی ایک قسم یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں کوئی اتنا بڑا واقعہ کیا جائے کہ حریف غیر ضروری طور پر چوکنّا ہو جائے اور اپنی بھرپور طاقت کو استعمال کر کے تحریک کو کچل ڈالے۔ دوسری سیاست یہ ہے کہ بظاہر بے ضرر اقدام سے آغاز کیا جائے جو حریف کو اتنا معمولی دکھائی دے کہ وہ اس کو نظر انداز کر دے۔ اس طرح تحریک کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ دھیرے دھیرے نفوذ کرتی رہے، یہاں تک کہ حریف کو اس کی ناقابل تسخیر طاقت کا اندازہ اس وقت ہو جب کہ معاملہ اس کے قابو سے باہر جا چکا ہو۔ ہندستان میں اولاً مسلم لیڈروں نے پہلی قسم کی سیاست چلائی اور وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے دوسرے قسم کی سیاست چلائی اور وہ کامیاب رہے۔ مہاتما گاندھی کا "چٹکی بھر نمک" بالآخر اتنا بڑا پہاڑ بن گیا جس کا بوجھ سنبھالنا برطانی سلطنت کو ناممکن دکھائی دینے لگا اور اس نے ہندستان کو آزاد کر دیا۔

دہلی سے طرابلس کے لیے میں ۱۹ دسمبر کی صبح کو چلا تھا اور اسی دن شام کو میں طرابلس پہنچ گیا۔ اس تقریباً ۹ ہزار کلومیٹر کے سفر کا آمد و رفت کا کرایہ ۱۳۶۵۸ روپیہ ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسے سفر کے لیے اتنی رقم درکار نہیں ہوتی تھی۔ مگر دوسری اس سے بڑی چیز جو درکار ہوتی تھی وہ وقت تھا۔ آج ایک شخص دہلی سے روانہ ہو کر ۱۲ گھنٹے کے اندر طرابلس پہنچ جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسے سفر کے لئے ۱۲ مہینے بھی یقینی نہیں تھے۔ مزید یہ کہ جانے والا اپنے متعلقین کو اس درمیان میں کوئی خبر نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس کے متعلقین کو اس کی خبر صرف اس وقت ہوتی تھی جب کہ وہ برسوں کے بعد اپنا سفر پورا کر کے دوبارہ اپنے وطن واپس آئے۔ جب کہ موجودہ زمانے کی امکانیات کا یہ حال ہے کہ یکم جنوری ۱۹۸۲ کو جب واپسی کے لیے میرا رزرویشن ہوا تو اسی دن ٹلکس کے ذریعہ بھیجی ہوئی یہ خبر دہلی میں میرے دفتر کو پہنچ گئی کہ ۵ جنوری کی صبح

کو میں دہلی پہنچنے والا ہوں۔

ہوائی جہاز کیا ہے، قدرت کی نقل۔ ہوائی جہاز دراصل قدرتی چڑیا کی مشینی نقل ہے۔ قدرت نے ایک چڑیا کے ہوائی سفر کے لئے جو اصول مقرر کئے ہیں اسی کو انسان کے ہوائی سفر میں استعمال کرنے کا نام ہوائی جہاز ہے۔ انسان کا یہ تضاد بھی کیسا عجیب ہے کہ وہ اپنی دنیا کے سفر کے لئے قدرت کی نقل کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر آخرت کے سفر کے لئے وہ قدرت کی نقل کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ مادی معاملات میں وہ جس معبود کا پرستار ہے۔ اسی معبود کی پرستاری روحانی اور اخلاقی معاملات میں اس کو منظور نہیں۔

طرابلس میں ہمارا قیام ہوٹل الکبیر (کمرہ نمبر ۴۰۸) میں تھا۔ جب میں اس کمرہ میں داخل ہوا تو یہ کمرہ مجھے بالکل اجنبی معلوم ہوا تھا۔ مگر دو ہفتے بعد ۴ جنوری ۱۹۸۳ کو جب میں اس کمرہ سے رخصت ہو کر نکلا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں اور کمرہ دونوں ایک دوسرے مانوس ہو چکے ہیں۔ یہی انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ وہ نئی چیز سے بھڑکتا ہے اور جس چیز سے زیادہ عرصہ تک وابستہ رہے اس کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ سچائی کو پانے کے لئے آدمی کا یہ مزاج اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ قدیم چیز کو محض انس کی بنا پر پکڑے رہتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی بے حقیقت ہو۔ وہ نئی چیز کو صرف عدم انس کی بنا پر اختیار نہیں کر پاتا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی سچائی ہو۔ حتیٰ کہ دلائل جب اس کے ذہن کو مفتوح کر لیتے ہیں اس وقت بھی وہ اقدام کرنے سے ہچکتا ہے۔ آدمی اکثر حالات میں اپنے مانوس گھروندوں کو حقیقی سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت وہ ہے جو دلیل سے ثابت ہو نہ کہ وہ جس سے مانوسیت کی بنا پر آدمی متعلق ہو جائے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۲ کی شام کو المجلس العالمی للدعوۃ الاسلامیۃ کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ تلاوت قرآن کے بعد ضروری کارروائی ہوئی۔ ۲۳ دسمبر کو مجلس کے قواعد و ضوابط مقرر کئے گئے۔ پورا دن اس میں صرف ہو گیا۔ ۲۴ دسمبر کو دعوتی مسائل پر گفتگو شروع ہوئی۔

ایک عرب نوجوان (السائح علی حسین) نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مسائل کے بارہ میں تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا: مشکلات الدعوۃ الاسلامیۃ فی العالم المعاصر۔ آخر میں انھوں نے کہا: آپ کی یہ مجلس اپنے علم اور تجربہ کی بنا پر اس قابل ہے کہ وہ متعین کرے کہ ہم کہاں سے شروع کریں (ان مجلسکم ہذا لھو المؤہل لعلمہ وخبرتہ لان یحدد لنا من این نبدأ) اس سلسلے میں مختلف ممبروں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ آج

سب سے پہلا اور بنیادی کام جدید تقاضوں کے لحاظ سے اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کی اشاعت ہے۔ مجلس عالمی کے اس اجتماع میں تین زبانیں رائج تھیں ـــــ عربی، انگریزی، فرانسیسی۔ میں نے اپنے خیالات انگریزی زبان میں پیش کئے۔ مقابل کے صفحہ پر میری تقریر کا متن نقل کیا جا رہا ہے۔

بعض ممبروں کا خیال تھا کہ موجودہ مسلمان دنیا بھر میں کروروں کی تعداد میں دشمنان اسلام کے ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ پہلے ہم کو انھیں بچانے کی فکر کرنا چاہیئے نہ یہ کہ ہم مسلمانوں کی تعداد بڑھانے میں لگ جائیں۔ میں نے کہا کہ دعوت اسلام کا مسئلہ مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ شہادت کی ذمہ داری ادا کرنے کا مسئلہ ہے۔ حضرت موسیٰ جب مصر میں تشریف لائے تو بنی اسرائیل پر وہاں کی قومی حکومت سخت مظالم کر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ نے ایک طرف بنی اسرائیل کو بچانے کی فکر کی، اسی کے ساتھ عین اسی وقت انھوں نے فرعون اور اس کی قوم کو حق کا پیغام دیا۔ سب سے اہم بات جو جاننے کی ہے وہ یہ کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان پر خاص طور پر ان کے علماء پر یہ لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ کسی بھی عذر کی بنا پر یہ ذمہ داری ان سے ساقط نہیں ہو سکتی۔

تاہم بحثوں اور گفتگوؤں میں لوگوں کا رخ دعوت سے زیادہ دفاع کی طرف رہا۔ آجکل پوری مسلم دنیا میں یہ حال ہے کہ "دشمنان اسلام" کے پیدا کردہ مسائل سے لوگوں کے ذہن اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ وہ دعوت کے پہلو پر زیادہ سوچ نہیں پاتے۔ حریف کو مدعو کی نظر سے دیکھنا ان کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ ایک بار اس موضوع پر گفتگو تھی کہ جہاد سے مراد اصلاً جہاد دعوت ہے نہ کہ قتال۔ اس پر ایک صاحب (مبارک قسم اللہ زاید سوڈانی) بولتے ہوئے کافی جذباتی ہو گئے۔ ان کے نزدیک اس قسم کی باتیں قتال سے فرار کا فلسفیانہ بہانہ تھیں۔ تقریر کے دوران ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا: این سیفنا الذی اخفیناہ این روح قتالنا الذی اھملناہ۔ یہ جملہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار رو پڑے اور آگے اپنی تقریر جاری نہ رکھ سکے۔

بعض لوگوں نے شدت کے ساتھ اس پہلو کی طرف زور دیا کہ ہم لوگ بات کرنے میں بہت آگے ہیں ـ مگر عمل کرنے میں اتنا ہی پیچھے ہیں۔ ایک صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ کہا: کلنا جید فی النظریۃ وکلنا عاجز فی التطبیق میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابھی خود "نظریہ" ہی واضح طور پر سامنے نہ آ سکا۔ اگر فی الواقع صحیح اور قابل عمل نظریہ لوگوں کے سامنے آ جائے تو عمل

Mr. Chairman and the members of the World Council,

It is really a great pleasure to be with you Muslim brethren from all over the world to discuss matters of Islamic Dawa. Islamic Dawa is, without doubt, the most important issue upon which we can get together. I congratulate Brother Dr. M.A. Sharif and the other authorities of Jamiat Al-Dawa on having provided us with this rare opportunity.

This international Islamic gathering symbolizes two great Islamic causes: firstly, united effort and secondly, orientation in the right direction. We can only achieve success by united effort, and Dawa is the only direction in which we should organize our struggle if it is to result in fruitful ends.

I pray God to be with you and bestow His help upon you, so that Islam may regain its former glory.

Now some words on the point of discussion. Brother Said Ali Hussain has rightly pointed out that the basic question is: from where to begin? The answer is: we should begin from literature. Producing literature is the principal task of Islamic Dawa.

At this time, the field of Dawa is open all over the world. But Dawa literature, in the real sense, exists nowhere. The most urgent need of our time is to prepare Islamic literature and to publish it in all the important languages. As our Japanese brother has pointed out, the lack of Islamic literature is the most acute problem of Islamic Dawa at present.

This is the same same method as was followed by the Islamic movement in the early period of its history. It is a well-known fact that the first revelation of the Quran was the verse, "Recite! Your Lord is the Most Bountiful One, who by the pen taught man what he did not know." (Quran, 96:3-4) This means that the teaching of God started through the pen, or in other words, through literature, which is the product of the pen.

One might say that there is so much Islamic literature. That is true, but it is still not sufficient. Either it is not prepared in contemporary style, or it is not meant as an introduction to Islam, but only as a defence of Islam.

Firstly, we need good and correct translations of Quran and Hadith in all the languages of the world, just as the Christians' Holy Book is found in all the prevailing languages of the world.

Then we need a set of books in which Islam is presented simply and scientifically.

Also we need some journals and periodicals in which Dawa issues all over the world are discussed regularly, and news concerning Islamic Dawa published.

So, the basic task ahead is to produce Dawa literature in every language. Islamic Dawa started from here in the beginning, and it should start from here again.

Thank you.

کرنے والوں کی کمی نہ ہوگی۔

موجودہ ۳۶ رکنی عالمی کونسل میں دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک علی آبی وہ جاپان سے آئے ہیں۔ وہ نومسلم ہیں۔ پہلے وہ سرکاری افسر تھے اب خود اپنا ایک قانونی ادارہ چلا رہے ہیں۔

علی آبی نے بتایا کہ ایک صاحب کسی عرب ملک کی طرف سے مبعوث ہوکر جاپان میں تبلیغ کے لئے آئے۔ تین سال تک وہ تبلیغ کرتے رہے۔ مگر کسی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ایک روز ایسا ہوا کہ انھوں نے کچھ جاپانیوں کے سامنے تقریر کی اور اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی۔ حدیث یہ تھی۔

عن ابی هریرة، قال جاء رجل الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال یارسول الله من احق الناس بحسن صحابتی قال امك۔ قال ثم من قال امك۔ قال ثم من قال امك۔ قال ثم من قال ابوك (متفق علیه) اس سادہ گفتگو کا اتنا اثر ہوا کہ اسی مجلس میں دس جاپانی مسلمان ہوگئے۔ انھوں نے بتایا کہ جاپانی قوم بنیادی طور پر مادری محبت (Mother-loving) والی قوم ہے اس لئے یہ حدیث اس کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ مزید انھوں نے بتایا کہ جاپانی قوم حقیقت پسند اور سنجیدہ مزاج قوم ہے۔ اس کو عملی باتیں اور مختصر باتیں زیادہ پسند آتی ہیں۔ اس لئے جاپان میں تبلیغ کرنے کے لئے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بہت زیادہ موزوں ہیں۔ مگر جاپانی زبان میں احادیث کا ترجمہ موجود نہیں۔ صرف ایک کتاب چھاپی گئی ہے مگر اس میں نکاح وطلاق کے مسائل تک ساری چیزیں درج ہیں۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ مرحلہ میں اگر اخلاقی اور روحانی حدیثوں کا ایک مجموعہ صرف سادہ ترجمہ کے ساتھ جاپانی زبان میں چھاپا جائے تو وہ جاپانیوں پر تبلیغ کے لئے بہت موثر ہوگا۔

میں نے ان سے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جاپانی قوم دنیا کی سب سے زیادہ ذہین قوم ہے۔ انھوں نے کہا ایسا نہیں۔ البتہ جاپانی قوم بے حد محنتی قوم ہے۔ ایک جاپانی کارکن دفتر یا کارخانہ میں کام کررہا ہے۔ اس کا مقررہ وقت ختم ہوجاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا تو وہ کام چھوڑ کر گھر جانا پسند نہیں کرے گا۔ وہ مزید دو گھنٹے محنت کرکے اپنا کام پورا کرے گا۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے جب میں سرکاری ملازم تھا تو اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ہفتہ میں اپنی دو دن کی چھٹی استعمال نہیں کی اور چھٹی کے دونوں دن دفتر جاکر اپنا کام مکمل کیا۔

علی آبی نے کہا ـــــــ جاپانی لوگ بالقوہ مسلمان ہیں:

مگر ہمارے یہاں جو باہر کے مسلمان آرہے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے ہیں۔ مثلاً جاپانی کھانا کھاتے ہوئے بائیں ہاتھ کو استعمال کرتا ہے، اس پر یہ لوگ سخت اعتراض کرتے ہیں وغیرہ یہ چیزیں جاپانیوں کے عمومی اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ جاپانی بنیادی طور پر سادہ، حقیقت پسند اور الفاظ سے زیادہ معانی پر دھیان دینے والا ہوتا ہے۔ اس لئے فطری اسلام اس کو بہت زیادہ اپیل کرتا ہے۔ مگر امام اور واعظین جس اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں وہ جاپانیوں کے لئے قابل قبول نہ ہوسکے گا۔

۲۶ دسمبر ۱۹۸۲ کو ندوۃ السیرۃ النبویہ کے نام سے ایک اجتماع یہاں کی ایک بڑی مسجد میں ہوا جو جمعیۃ الدعوۃ کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس اجتماع میں سیرت کے مختلف پہلوؤں کے بارہ میں مقالات پڑھے گئے اور ان پر سوال وجواب ہوا۔ یہ سیرت کے عام جلسوں کے برعکس ایک خالص علمی اجتماع تھا۔ اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس میں شریک تھے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لوگوں نے زیادہ محنت کر کے مقالات نہیں لکھے۔ متعلقہ موضوع سے متعلق جس کے دماغ میں جو کچھ تھا اس کو اس نے لکھ لیا اور یہاں آکر پڑھ دیا۔ سیرت کے موضوع پر بے شمار کتابیں اور مقالات لکھے جاچکے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سیرت پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ مگر سیرت کے بقیہ پہلو اسی وقت کھولے جاسکتے ہیں جب کہ اس کے لئے کافی محنت کی جائے۔

یہاں دنیا بھر سے مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ تقریباً ہر جگہ کے لوگوں نے بتایا کہ غیر مسلموں میں دین کی اشاعت کے کافی امکانات ہیں۔ امریکہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ امریکہ کے لوگ بے حد غیر جانبدارانہ انداز سے چیزوں کو دیکھتے ہیں اور جب کسی چیز کو پکڑ لیتے ہیں تو پھر اس کو چھوڑتے نہیں۔ یہ امریکی قوم کا مزاج ہے۔ اس لیے امریکہ میں اگر اسلام پھیل جائے تو یہ ہمارے لئے بہت زیادہ تقویت کا باعث ہو۔ مگر ہر جگہ کے لوگوں کی یہ مشترک شکایت تھی کہ جدید ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے پاس اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔

امریکہ کے ایک نوجوان جو اس اجتماع میں شریک تھے، ان سے اکثر ملی امور پر باتیں ہوتی رہیں۔ ان کا ذہن دعوتی سے زیادہ قومی تھا۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ دوسری قوموں کو ظالم اور مسلمان کو مظلوم بتاتے ہیں۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ظالم ہیں اور دوسری قومیں مظلوم۔ دوسری قومیں ہم سے اگر ہماری دنیا چھین

رہی ہیں تو ہم دوسری قوموں سے ان کی آخرت چھین رہے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا دعوتی نقطۂ نظر ان کے ذہن میں کچھ زیادہ بیٹھ نہیں رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ایسا ہوا کہ جب وہ کوئی بات چھیڑتے تو اکثر میں مسکرا دیتا۔ ۲ جنوری ۱۹۸۳ کو امریکہ جانے کے لئے وہ مجھ سے رخصت ہوئے۔ چونکہ یہ طے ہوا تھا کہ اسی سال کے آخر تک دوسرا اجتماع کیا جائے۔ اس فیصلہ کے پس منظر میں انھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ اب میں کچھ دنوں کے بعد آپ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ سکوں گا:

It will be several months before I see your smiling face again

۲۵ دسمبر ۱۹۸۲ کو طرابلس ریڈیو سے میری ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ تقریر ۲۰ منٹ کی تھی۔ انھوں نے اگرچہ وقت کی تحدید نہیں کی تھی۔ تاہم میں نے ۲۰ منٹ میں اپنی تقریر ختم کر دی۔ ربیع الاول کی مناسبت سے میں نے سیرت پر کچھ خیالات پیش کئے۔ یہ تقریر زبانی تھی۔ اس لئے اس کا متن تحریری صورت میں ہمارے پاس برائے اشاعت موجود نہیں ہے۔

۳۰ دسمبر کو طرابلس ریڈیو پر میرا دوسرا پروگرام تھا۔ یہ سوال وجواب کی صورت میں تھا۔ انٹرویور سوالات کرتا رہا اور میں جوابات دیتا رہا۔ دوسرے عام سوالات کے علاوہ یہ سوال بھی تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کا کیا حال ہے، کیوں کہ ہم سنتے ہیں کہ وہاں اکثر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ ہندستان بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ایک برا عظم کی مانند ہے۔ اس کی آبادی بھی بہت زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ ملک کی اکثریت ابھی تک جاہل ہے۔ ایسی حالت میں کبھی کبھی جھگڑے سے لڑائی کا ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ البتہ اہم بات یہ ہے کہ ان حالات کے باوجود ہندستان کے مسلمان برابر ترقی کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان اقتصادی اور تعلیمی سرگرمیوں میں واضح اضافہ ہوا ہے۔ نیز یہ کہ خود اکثریتی فرقہ میں قابل لحاظ تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ان میں سے ہزاروں افراد حالیہ برسوں میں اسلام قبول کر چکے ہیں۔

اس ضمن میں انٹرویور کا دوسرا سوال یہ تھا کہ ۱۹۸۳ میں آپ کے نزدیک کرنے کا اہم کام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی اسی سفر میں میں نے ریڈرز ڈائجسٹ (جولائی ۱۹۷۹) کا ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا: Islam on the March

اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام دوبارہ زندہ ہو رہا ہے اور نئی طاقت پکڑ رہا ہے۔ اسلام کے اس سفر کو ۱۹۸۳ میں ہمیں مزید شدت کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ موجودہ

زمانہ میں اسلامی دعوت کے زبردست امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھانا وہ سب سے اہم کام ہے جس پر ہمیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عام عرب کتابی عربی سے ایک ہندستانی عالم سے کم واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے گفتگو کے دوران "بالقوۃ" کا لفظ استعمال کیا تو عرب انٹرویور اس کو سمجھ نہ سکا۔ اس کے بعد میں نے انگریزی لفظ Potential کہا تو وہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

طرابلس میں بڑی تعداد میں غیر عرب مسلمان مقیم ہیں۔ ان مسلمانوں کے کئی اجتماعات ہوئے جن میں میری تقریر ہوئی۔ لوگوں نے نہایت غور سے باتیں سنیں اور دینی جذبات کا اظہار کیا۔

میرٹھ کا فرقہ وارانہ فساد ابھی حال میں ہوا تھا اس لئے کچھ لوگوں نے میرٹھ کے مسلمانوں کا حال پوچھا۔ میں نے کہا کہ میرٹھ کے مسلمان جس حال میں ہیں ٹھیک ہیں۔ آپ تو اپنی فکر کیجئے۔ کیونکہ ہر آدمی پر ایک روز "میرٹھ" گذرنے والا ہے۔ موت اور موت کے بعد قیامت، یہ سب سے بڑا "میرٹھ" ہے۔ لوگ دوسروں کے "میرٹھ" کو جانتے ہیں۔ مگر اپنے "میرٹھ" کی کسی کو خبر نہیں۔

ہمارے جو رہنما بیرونی ملکوں میں جاتے ہیں اور وہاں سے کامیاب ہو کر لوٹتے ہیں وہ اکثر ملّت کی بربادی کے نام پر یہ کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سامنے مسلمانوں کی مظلومیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کریں۔ جذباتی انداز میں تقریریں کر کے لوگوں کو اکسائیں تو آپ کو کثرت سے ایسے لوگ ملیں گے جو پر جوش انداز میں آپ کا تعاون کریں۔ لیکن اگر آپ دعوت دین کے لئے لوگوں کو ابھارنا چاہیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا آپ اسٹیچو کی بستی میں بول رہے ہیں جو نازک ترین بات پر بھی سننے اور تڑپنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

یہ صورت حال تمام عالم اسلام میں ہے۔ آپ قوم کی بربادی کے نام پر لوگوں سے بڑا بڑا تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر دین حق کی پیغام رسانی کے لئے کہئے تو ان کے اندر اس کام میں حصہ لینے کے لئے کوئی جذبہ نہیں بھڑکتا۔ قومی مصائب کے لئے پر جوش ہونا اور دین کی دعوت کے معاملہ میں بے حس بنا رہنا اسلام نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان آج جس مذہب پر قائم ہیں وہ قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ پھر قومی مذہب پر ہم کو وہ انعامات کیسے مل سکتے ہیں جو صرف خدائی مذہب اختیار کرنے پر مقدر کئے گئے ہیں۔

۳۱ دسمبر کی شام کو ایک صاحب کے گھر پر نشست ہوئی۔ تعلیم یافتہ لوگ جمع تھے۔ میں نے

قرآن کے بارہ میں تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ قرآن کو کس طرح پڑھنا چاہئے۔ مختلف مثالیں دے کر میں نے واضح کیا کہ قرآن کا صرف پڑھنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کو صحیح ذہن کے ساتھ پڑھا جائے۔ اکثر لوگ قرآن کو اپنے خیالات کی تصدیق کے لئے پڑھتے ہیں۔ مگر قرآن کو وہی پائے گا جو قرآن کو اپنے خیالات کی تصحیح کے لئے پڑھے۔

مثلاً ایک غیر مسلم قوم سے آپ کو نفرت ہے اور آپ کے ذہن میں یہ بھرا ہوا ہے کہ اس سے "جہاد" کیا جائے۔ اب آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ کو قرآن میں صرف یہ لکھا ہوا نظر آئے گا کہ "کافروں سے لڑو"۔ اس کے برعکس اگر آپ خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ان قوموں تک خدا کی دعوت پہنچاؤ۔ پہلا مطالعہ آپ کو دیگر اقوام سے بیزاری کا سبق دے گا اور دوسرا مطالعہ آپ کو دیگر اقوام سے محبت پر ابھارے گا۔ پہلے مطالعہ کے مطابق آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان حریف اور رقیب کا رشتہ قائم ہوگا اور دوسرے مطالعہ کے مطابق داعی اور مدعو کا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ـــــ یضل بہ کثیراً و یھدی بہ کثیراً

طرابلس میں بہت سے عرب نوجوانوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی ایک دو کی صورت میں اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کئی کئی نوجوان اکٹھے ملنے کے لئے آتے۔ میں نے ان لوگوں سے گفتگو میں خاص طور پر جس چیز پر زور دیا وہ یہ تھا کہ اسلام کا طریقہ کھلے ہوئے دائروں میں کام کرنے کا ہے نہ کہ بند دائروں میں سر ٹکرانے کا۔ عرب دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر نوجوانوں میں اسلام کے لئے کام کرنے کا جذبہ ابھرا ہے۔ مگر ان کی اکثریت اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہے اور حکمرانوں سے ٹکراؤ کو کام سمجھتی ہے۔ میں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میں اس قسم کی سیاست کو اسلامی سیاست نہیں سمجھتا۔ یہ یقینی طور پر اسلام سے انحراف ہے۔ اور مزید یہ کہ یہ اپنے وقت اور قوت کو ایسے میدان میں لگانا ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے مزید کہا کہ یہ بات میں کسی مصلحت کی بنا پر نہیں کہتا۔ بلکہ یہی میرا مستقل نظریہ ہے اور میں ۲۰ سال سے مسلسل تقریر اور تحریر کے ذریعے اسی کی اشاعت کر رہا ہوں۔

ہوٹل الکبیر میں ایک روز میری ملاقات ایک افغانی نوجوان سے ہوئی۔ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اب اس کے والدین سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں اور یہ نوجوان وہیں پر تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

اس نوجوان کا نام نجیب اللہ طیبی ہے۔ اس کی عمر ۱۷ سال ہے۔ وہ صرف انگریزی یا فرنچ بول سکتا ہے۔ اس خوبصورت افغانی نوجوان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی قوم اگر روسیوں سے لڑنے

کے لئے آپ کو افغانستان بلائے تو کیا آپ وہاں جاکر لڑنا پسند کریں گے۔ اس نے فوراً کہا ہاں۔ میں نے کہا کیا آپ کے والدین آپ کو افغانستان جانے کی اجازت دیں گے۔ جب کہ موجودہ حالات میں وہاں جانا گویا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے۔ اس نے جواب دیا، میں اپنے والدین کی اجازت کے بغیر وہاں جاؤں گا۔

بات چیت کے دوران میں میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کی یہ جنگ قوم کے لئے ہے یا خدا کے لئے ہے۔ اس نے کہا دونوں کے لئے۔ اس کے بعد کچھ دیر سوچ کر بولا:

I was born in my country and I want to die in my country

میں اپنے ملک میں پیدا ہوا اور اپنے ملک ہی میں مرنا چاہتا ہوں۔

ایک روز میں ہوٹل کی کسی منزل پر لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو اس کے اندر سے کئی عورتیں برآمد ہوئیں۔ سب کی سب خالص مغربی لباس میں تھیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ مغرب کی خواتین ہیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک خاتون کی آواز کان میں آئی: مافش فائدہ (اس میں کچھ فائدہ نہیں) اس جملہ کو سن کر میں نے سمجھا کہ وہ عرب خواتین ہیں۔ اس قسم کی خواتین یہاں مصری یا لبنانی ہوتی ہیں جو کام کے تحت یہاں مقیم ہیں۔

ایک روز میں نے اپنے کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تو فلم "الرسالہ" آرہی تھی۔ یہ وہ مشہور فلم ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بنائی گئی ہے۔ اسی طرح لیبیا کے مشہور مجاہد آزادی عمر مختار کی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا نام اسد الصحرا ہے۔ اسد الصحرا نہایت کامیاب فلم ہے۔ بلکہ فلموں کا شاہکار ہے۔ دوسری طرف "الرسالہ" ایک غیر موثر فلم نظر آئی۔ سیرت کا مطالعہ کرنے والے کو پیغمبر اسلام کی زندگی جتنی عظیم نظر آتی ہے، فلم کی تصویر کشی میں وہ بہت کم ہوگئی ہے۔ خالص فنی اعتبار سے غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہی ہستی کہیں نظر نہیں آتی جو کہانی کی اصل ہیرو ہے۔ مخصوص اسباب سے چوں کہ فلم ساز نہ اس میں پیغمبر اسلام کی شخصیت کو پیش کرسکا ہے اور نہ آپ کی آواز کو، اس لئے فلم گویا بے فلم ہوکر رہ گئی ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ جو بات فلم الرسالہ میں جائز طور پر ہے وہی پوری تاریخ میں ناجائز طور پر پائی جاتی ہے۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک دنیا میں ہزاروں پیغمبر آئے۔ مگر انسانی تاریخ میں پیغمبروں اور ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں۔ انسان کی مدون تاریخ پیغمبروں کے ذکر سے خالی ہے۔ حتیٰ کہ انسان نے موجودہ زمانہ میں عالم فطرت کی جو کہانی لکھی ہے

اس میں ہر چیز کا ذکر ہے مگر خدا کا کوئی ذکر نہیں ــــــــ وہ کہانی بھی کیسی عجیب کہانی ہے جس سے اس کے ہیرو کو حذف کر دیا گیا ہو۔

یہاں نماز کے وقت ٹیلی وژن سے اذان نشر ہوتی ہے۔ ایک روز میں نے مغرب کے قریب کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تو نہایت عمدہ عربی آواز میں اذان کی آواز آنے لگی۔ اذان کے وقت ٹیلی وژن اسکرین پر موذن کی تصویر نہیں آر ہی تھی۔ بلکہ قدرت کے مختلف مناظر ایک کے بعد ایک دکھائے جارہے تھے۔

عمدہ تصویر میں چیزیں اصل سے زیادہ حسین نظر آتی ہیں۔ چنانچہ رنگین ٹیلی وژن پر فطرت کے مناظر عجیب پر کیف معلوم ہو رہے تھے۔ آبشار کا بہنا، سبزہ کا لہلہانا، دریا کی روانی، چڑیوں کا چہکنا، پہاڑ کی بلندی، پھولوں کی قطاریں، غرض مختلف قسم کے مناظر فطرت بے حد مسحور کن انداز میں سامنے آرہے تھے۔ اس کے بعد جب موذن نے کہا حی علی الفلاح (آؤ کامیابی کی طرف) تو ایسا معلوم ہوا جیسے جنت کی ایک جھلک دکھا کر کہا جارہا ہو کہ یہ ہے خدا پرستی کا بدلہ۔ خدا کے سچے پرستار بن جاؤ اور خدا کی حسین جنت میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لو۔

۲۶ دسمبر کی دوپہر کو میجر جلود سے ملاقات تھی۔ قصر الشعب کے خصوصی کمرہ میں ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ انھوں نے عربی زبان میں ایک مفصل تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کا اصل کام دعوت اسلامی کا کام ہے۔ اور ہم نے خالص دعوتی کام کے لئے یہ تنظیم قائم کی ہے۔ اس سے مقصود کوئی سیاست نہیں ہے۔ وہاں سے واپسی میں کچھ تاخیر ہوئی۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں واپس پہنچا تو کمرہ کی چھوٹی میز میں ہدایتی بلب جل بجھ رہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ میرے نام کوئی پیغام استقبالیہ کے دفتر میں موجود ہے۔ میں نیچے گیا تو انھوں نے ایک نوٹ میرے حوالے کیا، اس میں لکھا تھا:

The Indian Ambassador has telephoned and wants to see you

(طرابلس میں ہندستان کے سفیر نے آپ کو ٹیلی فون کیا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں) اس بعد میں نے ٹیلی فون پر سفیر ہند (مسٹر ارجن اسرانی) سے بات کی۔ اگلے دن موصوف کی طرف سے دوسرا ٹیلی فون ملا کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر میرے لئے شام کے کھانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ تاہم یہاں میرے پروگرام کچھ اس قسم کے تھے کہ میں سفیر موصوف کے لئے مزید کوئی وقت نہ نکال سکا اور اس احساس کے ساتھ واپسی ہوگئی کہ میں موصوف کی دلچسپ باتیں سننے سے محروم رہا۔

دو عربوں سے باتیں کرتے ہوئے ایک بار میں نے نُضج (پختگی) کا لفظ استعمال کیا۔ وہ مجھ

نہ سکے۔ بالآخر میں نے یہ لفظ کاغذ پر لکھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا اچھا نڈگ۔ یہ لوگ نفیج کا تلفظ نڈگ کرتے ہیں۔ تلفظ میں اس قسم کے فرق کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ غیر عرب کی بات عرب کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آتی اور اس طرح عرب کی بات غیر عرب سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

عربوں میں یہ عجیب ذوق نظر آتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے یہاں اسلامی الفاظ کے بجائے عام قسم کے معاشرتی الفاظ رائج ہو گئے ہیں۔ مثلاً جزاک اللہ کی جگہ شکراً، السلام علیکم کی جگہ صباح الخیر وغیرہ۔ موجودہ الفاظ بھی اگرچہ اچھے الفاظ ہیں۔ مگر اسلام کے دعائیہ الفاظ میں جو معنویت ہے وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہو سکتی۔

۴ جنوری کو واپس ہوتے ہوئے میں طرابلس کے ہوائی اڈہ (مطار) پر پہنچا تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہاں میں نے سمت قبلہ دریافت کی تو مجھے بتایا گیا کہ یہاں مسجد موجود ہے۔ آپ مسجد میں جا کر نماز ادا کر لیں۔ ہدایت کے مطابق میں آگے بڑھا تو ایک خوبصورت بورڈ پر "مسجد" لکھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوا تو وہاں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں مسجد کی تمام ضروریات کا انتظام تھا۔ وہاں کچھ لوگ پہلے سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی اطمینان سے نماز ادا کی اور اس کے بعد طرابلس سے روم جانے والا جہاز پکڑنے کے لئے باہر آیا۔

۵ جنوری ۱۹۸۳ کو میں دہلی واپس آیا۔ واپسی میں ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے بغل میں ایک مستشرق تھے، وہ روم سے ہندستان جانے کے لئے سوار ہوئے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں نے "ویجیٹیرین" مانگا۔ مذکورہ مستشرق نے بھی ویجیٹیرین کی فرمائش کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تو یورپ کے رہنے والے ہیں اور یورپ میں عام طور پر گوشت پسند کیا جاتا ہے۔ پھر آپ نے ویجیٹیرین کی فرمائش کیوں کی۔

Dr. J. Uacek, Oriental Department
Charles University,
Prague, Czechoslovakia.

انھوں نے کہا کہ میں انڈین کلچر پر ریسرچ کر رہا ہوں اور اس وقت اسی سلسلے میں ہندستان جا رہا ہوں۔ جب میں نے انڈین کلچر پر ریسرچ کا فیصلہ کیا تو اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی ارادہ کیا کہ میں اپنے آپ کو انڈین طریقہ کا عادی بناؤں اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اس کے قریب کروں تاکہ بخوبی طور پر اس کو سمجھ سکوں۔ چنانچہ اسی وقت سے میں گوشت چھوڑ کر سبزی کھانے لگا ہوں۔ چوں کہ ہمارے یہاں سبزی ملنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے اس لئے میری بیوی میرے گھر کے کمپاؤنڈ میں سبزی اگاتی ہیں اور میرے لئے الگ سے سبزی پکاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے سنسکرت زبان بھی سیکھی۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کر کے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

Regd. R.N. No. 28822/76
Regd. D(DN) No. 532

November 1983
Issue No. 84

AL-RISALA MONTHLY

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi - 110 006 (India)
Telephone : 232231, 526851